ادارۂ اسلامیات ○ لاہور

پہلی بار عکسی طباعت ———— ۱۴۰۶ھ
باہتمام ———— اشرف برادران سلمہم الرحمٰن
ناشر ———— ادارۂ اسلامیات ۔ لاہور
طباعت ————
کتابت ———— مشتاق احمد جلالپوری
قیمت ————

ملنے کے پتے:

ادارۂ اسلامیات، ۱۹۰۔ انارکلی لاہور نمبر ۲
دارالاشاعت، اُردو بازار۔ کراچی نمبر ۱
ادارۃ المعارف ڈاکخانہ دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴
مکتبہ دارالعلوم، ڈاکخانہ دارالعلوم، کراچی نمبر ۱۴

فہرست مضامین

تقریظِ منظوم

برتحریر دل پذیر حضرت مہتمم صاحب دار العلوم دیوبند

از حضرت مولانا حافظ محمد ادریس صاحب کاندھلوی

شاد باش اے خستہ بیمارِ نظر — کز برایت می رسد کحل البصر
ایں حقائق ایں معارف را ببیں — ایں چنیں بیند نگاہِ دُور بیں
ریختہ از کلکِ آں روشن ضمیر — کہ ندارد از حقائق او نظیر
"طیّبِ" ابنِ قاسم است آں ارجمند — ناظمِ دارُ العُلوم دیوبند
ہست قرآں یک ولیکن اَحولاں — از حَوَل بینند آں را دو قرآں
ہمچنیں اسلام یک اے خوش سیر — لیک دو اسلام گوید بد نظر

اَحوَلی چوں دفع شد یکساں شوند
آں دو سہ گویاں یکے گویاں شوند

مقدّمہ

زاویۂ نظر (ANGLE OF RISION) کا اختلاف معمولی نتائج نہیں پیدا کرتا بلکہ فاش اہم غلطیوں کا موجب ہوتا ہے۔ اگرچہ ابتداءً ایک زاویہ کے دو خطوط ایک ہی نقطہ سے شروع ہوتے ہیں، لیکن جوں جوں آگے بڑھتے جاتے ہیں دونوں خطوط کے درمیان فاصلہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ خواہ زاویہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ حسب ذیل شکل ملاحظہ فرمایئے :-
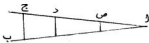
"ا" ایک نقطہ ہے جہاں سے "اب" ایک خط شروع ہو کر آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اب جتنے خطوط "ا" سے شروع ہو کر "ب" تک پہنچنا چاہیں گے انہیں لامحالہ اب کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر کوئی خط شروع ہوتا ہے "ا" ہی سے اور پہنچنا بھی چاہتا ہے "ب" تک مگر "اب" کا راستہ اختیار نہیں کرتا بلکہ تھوڑا سا انحراف کر کے "اج" کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ کبھی "ب" تک نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ اوّلاً تو "ص" کے مقام پہ دونوں خطوط کے درمیان بہت کم فاصلہ نظر آئے گا لیکن آگے بڑھ کر "د" کے مقام پہ یہ فاصلہ اور بھی زیادہ ہو جائے گا اور "ج" کے مقام پر تو بہت ہی زیادہ ہو جائے گا۔ علیٰ ہذا القیاس۔ حالانکہ دونوں خطوط کا نقطۂ

آغاز (STARTING POINT) بھی ایک ہے اور منزلِ مقصود (DESTINATION) بھی ایک ہی تھی۔ مگر ایک خطِ صحیح راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے منزلِ مقصود تک پہنچ گیا اور دوسرا اپنی جدتِ طبع سے دوسرا راستہ اختیار کر کے منزل سے کوسوں دُور ہو گیا۔ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۔

اسی طرح حسبِ ذیل مثال پر عمل کر کے دیکھئے کہ کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

ایک خالی پیالہ میں ایک سیدھی لکڑی اس طرح رکھ دیجئے کہ لکڑی کا کچھ حصہ پیالے سے باہر نکلا رہے اور بغور دیکھئے کہ لکڑی کہیں سے ٹیڑھی تو نظر نہیں آتی۔ یقیناً آپ کہیں گے کہ لکڑی بالکل سیدھی ہے۔ اب اسی پیالہ کو پانی سے بھر دیجئے اور پھر لکڑی کو بغور دیکھئے۔ لکڑی کا وہ حصہ جو پانی میں ڈوبا ہوا ہے آپ کو ٹیڑھا نظر آئے گا۔ یہ کیوں؟ اس کی تشریح سنیئے۔ پیالہ میں پانی بھرنے سے قبل لکڑی کے ہر حصہ سے جو روشنی کی شعاعیں چلتی تھیں وہ صرف ہوا کے ماحول (MEDIUM) سے گزر کر آنکھوں تک پہنچتی تھیں کیونکہ ہوا پوری فضا (ATMOSPHERE) کو گھیرے ہوئے ہے۔ جہاں کوئی دوسرا ماحول موجود نہ ہو، وہاں ہوا خود بخود موجود رہتی ہے۔ اسی لئے لکڑی حقیقتہً جیسی سیدھی تھی ویسی ہی نظر آ رہی تھی اور جب پیالہ میں پانی ڈالا گیا تو ماحول میں آمیزش پیدا ہو گئی۔ اب پانی میں ڈوبے ہوئے حصہ سے روشنی کی جو شعاعیں چلتی ہیں اُن کا سابقہ سطحِ آب تک آتے ہی ہوا کے ماحول

(MEDIUM) سے پڑتا ہے۔ اس لئے وہ ٹیڑھی (REFRACT) ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لکڑی کا وہ حصہ جو سطحِ آب سے باہر ہے وہ پہلے ہی جیسا سیدھا نظر آتا ہے مگر جو حصہ زیرِ آب ہے وہ ٹیڑھا دکھائی دیتا ہے حالانکہ لکڑی اب بھی حقیقتاً وہی ہے جو پہلے تھی اور ویسی ہی سیدھی ہے جیسی پہلے تھی۔ مگر زاویۂ نظر (ANGLE OF VISION) بدل جانے کی وجہ سے ٹیڑھی نظر آ رہی ہے۔

بعینہٖ یہی حال ذہن کا ہوتا ہے جب تک ذہن پر کسی ماحول کا اثر نہیں ہوتا، اُس وقت تک وحدانیت (MONOTHEISM) ذہن کی پوری فضا (ATMOSPHERE) کو گھیرے ہوئے رہتی ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے کسی ماحول کی عدم موجودگی میں ہوا پوری فضا (ATMOSPHERE) پر مسلط رہتی ہے۔ ایسی حالت میں ذہن کی شعاعیں جب اشیائے معقولہ تک پہنچتی ہیں تو ان میں کہیں بھی کجی نہیں پیدا ہوتی۔ اس لئے وہ اشیاء فی نفسہٖ جیسی ہوتی ہیں ویسی ہی نظر آتی ہیں اور ذہن اُن کا صحیح ادراک کرتا ہے۔ لیکن جب وحدانیت کی فضاء دوسرے اثرات کے ماحول سے مکدر ہو جاتی ہے تو ذہن کی شعاعیں اشیائے معقولہ تک پہنچتے پہنچتے ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ذہن کے لئے ان کا صحیح ادراک ناممکن ہو جاتا ہے۔

اب اگر وحدانیت کی فضاء دوسرے اثرات سے اس طرح مکدر ہو چکی ہے کہ ذہن پر ثنویت (DITHEISM) کے ماحول کا غلبہ ہو گیا تو ذہن کی شعاعیں اشیائے معقولہ تک پہنچتے پہنچتے کافی ٹیڑھی (REFRECT) ہو جائیں گی۔ اس لئے ذہن ان کا صحیح ادراک

نہ کر سکے گا۔ اور اگر وحدانیت کی فضاء کو مکدر کرنے والے اثرات ایسے ہیں جو ذہن پر تثلیث (TRITHEISM OR TRINITY) کے ماحول کا غلبہ کر دیتے ہیں تو ذہن کی شعاعوں میں اشیائے معقولہ تک پہنچتے پہنچتے اور بھی کجی (REFRACTION) آجائیگی اور کہیں وہ اثرات ایسے ہوئے جو ذہن پر اصنام پرستی (POLYTHEISM) کے ماحول کا غلبہ کر دیتے ہیں تو ذہن کی شعاعوں میں اس قدر کجی آجائے گی کہ اشیاء کچھ کا کچھ نظر آئیں گی۔

جناب غلام جیلانی صاحب برق کے ذہن پر ثنویت کے ماحول کا غلبہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے انہیں تمام چیزیں جفت نظر آتی ہیں۔ پہلے "دو قرآن" نظر آئے تھے اور اب حال ہی میں موصوف کو اسلام بھی دو ہی نظر آنے لگے اور اس موضوع پر ایک کتاب "دو اسلام" کے نام سے تصنیف کر ڈالی۔ اب دیکھئے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر خدائے قدوس کے بارہ میں کیا رویہ اختیار فرماتے ہیں۔

موصوف نے ایک قرآن تو وحیٔ متلو (جس کی ہم تلاوت کرتے ہیں) کو قرار دیا ہے جس کا نام "علمی قرآن" رکھا ہے اور دوسرا قرآن صحیفۂ کائنات کو قرار دیا ہے جسے "عملی قرآن" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ لیکن پوری کتاب میں موضوعِ بحث صرف صحیفۂ کائنات یا بالفاظ جیلانی صاحب "عملی قرآن" ہی ہے۔ علمی قرآن کو بظاہر کوئی اہمیت ہی نہیں دی گئی اور اسی صحیفۂ کائنات کے مطالعہ کو عین اسلام قرار دیا گیا ہے۔ دیکھئے "دو قرآن" صفحہ ١١ و صفحہ ١٢۔

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے پیشِ نظر کتاب

میں برق صاحب کے نظریہ پر اصولی تبصرہ فرمایا ہے۔ چنانچہ مولانا موصوف نے یہ ثابت کیا ہے کہ جزئیات کے حسن و قبح کا مدار اُن کلیات پر ہوتا ہے جن کے ماتحت وہ جزئیات ہوتی ہیں اور ادراکِ کلیات تابع ہے ذوق اور ذہنیت کے، اس لئے اگر ذوق اور ذہنیت سلیم اور مستقیم ہے تو اس ذہنیت سے اُبھرنے والے کلیات کے ادراکات بھی صحیح ہونگے اور ان کلیات سے نکلنے والی جزئیات بھی۔ اور اگر ذوق کجی لئے ہوئے ہے تو اس سے نکلنے والے کلیات اور ان کلیات کے تحت میں آنے والی جزئیات دونوں کے ادراک میں غلطی ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ذوق و ذہنیت کی اصلاح و تقویم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اور اس اصلاح و تقویم کا نام تزکیہ رکھکر اسے نبوت کے فرائض چارگانہ میں سے ایک اساسی فریضہ قرار دیا جس کا ذکر قرآن پاک میں تعلیم سے پہلے بھی آیا ہے اور تعلیم کے بعد بھی آیت یتلوا علیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ۔ ربنا وابعث فیہم رسولا منہم یتلوا علیہم آیاتک ویعلمہم الکتاب والحکمۃ ویزکیہم۔

برق صاحب نے اسلام کا منشا، تسخیرِ کائنات قرار دیا تھا جس کے نتیجہ میں انسان مادیات کا محتاج بنکر رہ جاتا ہے۔ اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ نے اسلام کا منشاء ایسے کمال کا حصول قرار دیا ہے جو موجبِ رضاءِ الٰہی ہے جس کا نمونہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی ہے "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃٌ حسنۃٌ" یہ دامن عین قرآن کے مطابق ہے جو انسان کو سفلیات و مادیات سے اٹھا کر الٰہیات کی لامحدود وسعتوں میں پہنچا دیتا ہے جہاں سے وہ تمام کائنات پر حکومت کرتا ہے اور کائنات کا ہر ہر جزء اسکے اشارہ ابرو کی تعمیل کرتا

ہے۔ لا یزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتی احببتہ فاذا احببتہ فکنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ ویدہ التی یبطش بہا ورجلہ التی یمشی بہا۔ رواہ البخاری (مشکوٰۃ باب ذکر اللہ عزوجل والتقرب الیہ ص۱۹۷) ۔ برق صاحب نے قرآن کی تقسیم ثنویت کی ذہنیت کے ماتحت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن دو ہو گئے۔ مگر ان دونوں میں کوئی ربط باقی نہ رہا اور سب سے بڑی کوتاہی یہ ہوئی کہ اس تقسیم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کیلئے جو حسب تصریح اثرِ صحیح کان خلقہ القرآن عملی قرآن ہے کہیں گنجائش نہیں رکھی گئی۔

اسکے مقابلہ میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ نے اول تو تعدد قرآن ہی کی نفی فرمائی پھر فرمایا کہ اگر بطور تفنن طبع تعددِ قرآن کے نظریہ کو مانا بھی جائے تو تین عنوان کیساتھ، تاکہ کتاب اللہ علمی قرآن، کائناتِ الٰہی برہانی اور تمثیلی قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی عملی قرآن قرار پائے۔ اور اس طرح علمی قرآن احکام کا مجموعہ، تمثیلی یا کائناتی قرآن دلائل وامارات کا مجموعہ اور عملی قرآن یعنی ذاتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نمونۂ عمل ہو۔ اس عنوان میں کسی قدم پر قرآن وسنت کی مخالفت بھی لازم نہیں آتی اور تینوں میں کمالِ ربط بھی قائم رہتا ہے۔ برق صاحب کے نظریہ کے مطابق کسی نبی کی بعثت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ کے پیش کردہ نظریہ کے مطابق نبی کی بعثت ضروری ہوتی ہے تاکہ نمونۂ عمل انسانوں کے سامنے آجائے۔ بہرحال حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے اس موضوع پر بہت مکمل اور مدلل بحث فرمائی ہے اور کسی گوشہ کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ رسالہ دارالعلوم نے اس پورے مضمون کو دس قسطوں میں شائع کیا تھا اب ادارہ نشر واشاعت نے بعد نظرِ ثانی کتابت کی بعض فاش غلطیوں کی اصلاح کر کے اُسے شائع کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔ ؎

عزیز احمد قاسمی بی۔ اے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تمہید

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

امّا بعد! محترم پروفیسر غلام جیلانی صاحب برق کا مضمون "دو قرآن" ماہِ محرم ۱۳۷۰ھ میں نظر سے گزرا جب کہ میں کراچی میں مقیم تھا۔ یہ مضمون ۱۹۴۲ء میں اُن کے قلم سے نکل کر رسالہ "البیان" میں قسط وار شائع ہوا اور آج ۲۲۴ صفحات کی ایک مستقل کتاب کی صورت میں اصحابِ نظر کے سامنے ہے۔ مصنف نے "دو قرآن" کے عنوان سے اس قرآن مجید کو جو اوراق میں مرقوم شدہ ہمارے سامنے ہے "علمی قرآن" کہا ہے جو ایک ضابطۂ حیات ہے اور اس پوری کائنات کے محسوس صحیفے کو جو اپنی پُرعظمت شکل میں عناصرِ اربعہ اور موالیدِ ثلاثہ کو دامن میں لئے ہوئے ہماری آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہے "عملی قرآن" کہا ہے۔ یعنی ایک قرآن خدا کا قول ہے اور ایک قرآن اس کا فعل ہے۔ مؤلف نے ان دونوں قرآنوں کی آیتوں کو جن میں کتاب کی آیتیں تشریعی ہیں اور کائنات کی تکوینی ایک دوسرے پر منطبق کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ جس طرح اس علمی قرآن کا مطالعہ فرض ہے اسی طرح اس علمی قرآن یعنی صحیفۂ کائنات کا مطالعہ بھی فرض ہے۔ بلکہ پہلے مطالعہ

سے بھی زیادہ اہم ہے کیونکہ :-

"مطالعۂ کائنات کی اہمیت کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن میں وضو، نماز، صوم و زکوٰۃ، حج طلاق قرض وغیرہ پر ڈیڑھ سو آیات ہیں اور مطالعۂ کائنات کی سات سو چھپن، (دو قرآن ص۱۱)"

(حالانکہ انہیں پتہ نہیں صرف ایک نماز ہی کی تاکید سات سو آیتوں میں فرمائی گئی ہے) -

پھر ان مقدمات سے نتیجہ نکالتے ہوئے کہ نزولِ قرآن کا اہم مقصد ہی کائنات کا مطالعہ ہے، دعویٰ کیا گیا۔ ہے کہ ان مادی اور تکوینی امور سے انتفاع اور استفادہ کرنا ہی قرآن کا اصل موضوع اور حقیقی منشائے خداوندی ہے جس کو ترقی کرنا چاہیئے بلکہ یہ استفادہ و انتفاع ہی وہ حقیقی دین ہے جس کو لے کر قرآن نازل ہوا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ :-

"اگر آج یہ کتاب (قرآن) ہمیں معادنِ ارضیہ، دخائنِ جبال اور خزائنِ بحار سے مستفید ہونے کا درس نہیں دیتی اور ترقی یافتہ اقوام کا ہمدوش نہیں بناتی تو یہ کتاب (خاکم بدہن) صراحتہً ناقص و نامکمل ہے اور اس کا دعویٰ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (میں نے آج تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا) نعوذ باللہ بے بنیاد ہے"۔ (دو قرآن ص۱۱)

پھر اس کائنات سے استفادہ کی صورت (جو بزعم برق صاحب منشاءِ خداوندی

اور مقصد نزولِ قرآن ہے) وہ بتائی گئی ہے جو آج کی مادہ پرست مغربی اقوام نے پیش کی ہے۔ یعنی مادیات کی ترکیب و تحلیل اور تجزیہ و تالیف کے ذریعہ ایجادات اور تمدنی ترقیات وغیرہ، نہ وہ کہ جس کا نمونہ علمائے اسلام پیش کر رہے ہیں۔ چنانچہ فرمایا :-

"آج اہلِ مغرب لوہے، تانبے، بارود اور دیگر خزائنِ ارضی سے فائدہ اُٹھا کر فلکِ علم و ہنر پر آفتاب بنے ہوئے ہیں، ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں اور دریاؤں میں تیر رہے ہیں، زمین کے بعید ترین اطراف کی خبریں لمحوں میں سُن رہے ہیں عمل تبخیر سے ریلیں دوڑا رہے ہیں، آنے والے حوادثِ سماویہ (بادو باراں) کی خبریں دے رہے ہیں یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ صحیفۂ کائنات کا مطالعہ کرنے کے بعد اُس کے قوانین و آیات کو اپنی بہتری کے لئے استعمال کر رہے ہیں اور دوسری طرف ہمارا مذہبی رہنما یعنی مُلّا اعمالِ خدا سے اس قدر جاہل، منشائے الٰہی سے اس قدر کورا اور مطالعۂ کائنات سے اس قدر بیگانہ ہے کہ اسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ ہوا میں چراغ کیوں بجھ جاتا ہے؟ اور آگ کیوں بھڑک اُٹھتی ہے؟ دل کیوں دھڑک رہا ہے؟ سانس کی آمد و رفت کیوں ہے؟ دست و پا دل و دماغ حواس و اعصاب اور عروق و عضلات میں اللہ تعالیٰ کے کون کون سے معجزات موجود ہیں؟ رحمِ مادر میں بچے کی تخلیق کس طرح ہوتی ہے؟ مرورِ زمانہ کا کرۂ ارض پر عمل کیا اور کیوں ہے؟ الغرض مُلّائے اسلام اعمالِ الٰہی سے یکسر غافل، معجزاتِ تخلیق سے قطعاً

ناآشنا، فطرت کے ایمان افروز کارناموں سے بالکل بیگانہ ہے اور پھر بھی علم کا مدعی ہے ۔" (ردِ قرآن ص۱۲)

پھر کہا گیا ہے کہ خلافتِ الٰہی کے معنی بھی اسی مادی ترقی کے ہیں جس کے لئے خدا نے انسان کو اپنا نائب اور قائم مقام بنا کر اُتارا ہے اور یہی اطاعتِ خداوندی ہے، چنانچہ کہتے ہیں :-

"زمین پر انسان اللہ کا قائم مقام ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ مادہ کو توڑ پھوڑ کر تخلیق کے نئے نئے مناظر دکھاتا ہے اسی طرح انسان کو بھی اللہ کی پیروی کرنا چاہیئے اور لوہے تانبے اور دوسرے معادن سے موٹریں، جہاز اور دیگر قوت کے سامان تیار کرنا چاہئیں ۔ اطیعوا اللہ (تم اللہ کی اطاعت کرو ۔" (ردِ قرآن ص۱۲)

پھر "ردِ قرآن" ص۱۵ پر کہا گیا کہ :-

"ایمانداری درحقیقت یہی دُنیا داری ہے، یعنی دُنیوی اور مادی ترقی ہی وہ عُلوّ و عظمت ہے جس کو قرآن نے "اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ" کے عنوان سے ظاہر فرمایا ہے، اس لئے حقیقتاً مومن مغرب کی وہ ملحد اقوام ہیں جو اس مادی جوڑ توڑ میں اس وقت سب سے آگے ہیں، اور کافر و منکر درحقیقت اس وقت کی وہ مسلم اقوام ہیں جو ان مادی وسائل اور ان کی ترقیات میں فی زمانہ پسماندہ ہیں وغیرہ وغیرہ ۔"

بہرحال تالیفِ زیرِ نظر کے دعاوی اور مقاصد کا خلاصہ یہ ہے کہ منشائے خداوندی مقصدِ نزولِ قرآن، معنیٔ ایمان، مطلبِ خلافت اور حقیقی علو و عظمت یہی مادی وسائل کی ترقیات اور یہی کرۂ ارض کے مختلف خطوں کی حکمرانی ہی ہے اور ان ہی تکوینی اُمور کے تکمیل کنندے فی الحقیقت خلفائے الٰہی، قرآن کے مطیع اور اللہ کے مومن و قانت بندے ہیں، ورنہ جو لوگ بھی ان سائنٹیفک ترقیات و ایجادات سے نابلد ہیں وہ علمِ قرآن سے نابلد، فہمِ قرآن سے عاری اور منشائے الٰہی سے جاہل ہیں ۔

تمہید کی اس اصولی بحث کے بعد مصنف نے اسی اصول کی روشنی میں آئندہ پوری کتاب میں جزئیات کا ذخیرہ پیش کرتے ہوئے مختلف آیاتِ قرآنی سے اس دعوے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کائنات کا یہی استعمالی مطالعہ اور اس کے مواد و عناصر میں یہی ایجادی تصرفات اس کے کھلے اور چھپے خزانوں کی یہی تسخیر اور اُن سے نفع اٹھانے کے لئے زندگی کو وقف کر دینا ہی تخلیقِ انسانی کا مقصد اور قرآن حکیم کا حقیقی منشاء ہے ۔

جہاں تک سائنس کے اصول کے مطابق قرآنی آیات کو کائناتی آیات پر ڈھالنے اور تکوینی عجائبات کو قرآن کا موضوع دکھلا کر تشریح کی اس معجز کتاب سے ان کے استخراج کا تعلق ہے برق صاحب کی یہ کاوش اور خدمت کوئی نئی اور اچھوتی خدمت نہیں ہے، اِن سے پہلے علامہ مشرقی (خاکسار لیڈر) اپنی کتاب "تذکرہ" میں اور اُن سے بھی پہلے علامہ طنطاوی مصری اپنی تفسیر جواہر القرآن میں اس خدمت

کو انجام دے چکے ہیں اور اصحابِ نظر اس کا کھرا اور کھوٹا بھی واضح کر چکے ہیں اس لئے برق صاحب کی زیرِ نظر تالیف ایک مصری اور ایک ہندی کا نقشِ قدم ہے جسے نقشِ ثالث کے طور پر انہوں نے پیش کیا ہے۔ تاہم ایک علمی کاوش کی حیثیت سے ان کی یہ محنت بایں معنی قابلِ لحاظ بھی ہے کہ اس سے علمی سلسلے کے کچھ نئے پہلو ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن پر ناقدانہ غور و فکر کرنے سے قرآنی حقائق کے بہت سے مخفی گوشوں کے کھل جانے کا موقع نکل آیا ہے۔ گو خود برق صاحب کے پیش کردہ پہلو منشائے قرآنی اور قواعدِ شرعیہ کے سر تا سر خلاف بھی ہیں۔ کیونکہ جس نظریہ اور نصب العین کی روشنی میں یہ جزئیاتی پہلو سامنے لائے گئے ہیں وہ نظریہ خود قرآنی منشاء اور موضوعِ قرآنی کے خلاف جا رہا ہے۔ اس لئے یہ جزئیاتی کاوش بھی قرآنی نقطۂ نظر سے مستحسن نہیں ٹھہر سکتی۔

جزئیات کا حسن و قبح کلیات کے تابع ہے

وجہ یہ ہے کہ جزئیات یا فرعیات کسی بھی دائرہ کی ہوں اور کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہوں خود ان کا حسن و قبح بذاتہٖ کوئی معیاری حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ان کی خوبی و خرابی کا معیار درحقیقت وہ کلیات یا اصول ہوتے ہیں جن کے سلسلہ سے وہ پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً اگر ایک شخص نماز کے شرعی فضائل بیان کرے مگر خود نماز کو ذکر اللہ اور قربِ الٰہی کے بجائے پہلوانی کے نقطۂ نظر سے دیکھ کر ایک جسمانی ورزش قرار دے تو اگرچہ یہ فضائل خود اپنی جگہ کتنے ہی صحیح ہوں مگر اس خاص نقطۂ نظر کے ماتحت غلط ہو

جائیں گے۔ اس لئے بات صحیح ہونے کے باوجود اصولاً کذبِ محض اور خلافِ واقعہ ہو جائے گی۔ یا اگر ایک شخص حج کے شرعی محاسن پر تقریر کرے مگر خود حج کو سیاسی نقطۂ نظر سے محض ایک بین الاقوامی کانفرنس تصور کرتا ہو جو تبادلۂ افکار یا مظاہرۂ اجتماعیت کے لئے منعقد کی گئی ہو نہ کہ مظاہرۂ عشق و محبت خداوندی کے لئے، تو یہ سارے فضائل اصل نقطۂ نظر سے غلط ٹھہر جائیں گے۔ اگرچہ خود یہ فضائل صحیح اور منصوص بھی ہوں۔ کیونکہ سلسلۂ نظر بدل جانے سے ان کا استعمال بے محل ہو گیا۔ اور وہ کذبِ محض ہو گئے۔

یا اگر ایک شخص قربانی جیسی عبادت کے مناقب تو شرعی بیان کرے مگر خود وہ قربانی کو فدیۂ نفس یا بدلِ جان سمجھنے کے بجائے معاشی نقطۂ نظر سے محض غریبوں کی خبر گیری کا ایک اقتصادی پہلو تصور کرتے ہوئے اس کی غرض و غایت صرف اعانتِ فقراء و مساکین بتلائے اور اس لئے خون بہانے کے بجائے پیسے خرچ کر دینے کو کافی ہی نہیں بلکہ ضروری سمجھے تو فضائل قربانی پر اس کا یہ سارا بیان غلط ٹھہر جائے گا کیونکہ نقطۂ نظر کے بدل جانے سے یہ فضائل قربانی کے فضائل ہی نہ رہے۔

یا اگر ایک شخص علم کی ضرورت و فضیلت پر قرآنی آیات پیش کر کے ایک مدلل اور معقول تقریر کرے مگر عمرانی نقطۂ نظر سے یہ علم اس کی نگاہ میں فلسفہ و سائنس یا ہندسہ و ریاضی ہو تو یہ ساری تقریر اس لئے غلط ہو جائے گی کہ منصوص فضائل کی یہ تقریر اس نے خود اپنے زاویۂ نگاہ سے کی ہے نہ کہ قرآنی نقطۂ نظر سے۔ گو فضائل کی آیات و روایات اپنی جگہ بالکل حق اور درست ہوں۔

بہر حال نقطۂ نظر کی تبدیلی سے جزوی مسائل کی نوعیت بدل جاتی ہے کیونکہ

اُن کی صحت وسقم اور حسن وقبح کا مدار اُس کلیہ اور اصولی نقطۂ نگاہ پر ہوتا ہے، جس کے ماتحت یہ جزئیات سامنے لائی جاتی ہیں۔ یہ علمی اور نظری فرق ایسا ہے جیسا کہ عمل کے دائرہ میں شرعی حسنات خُبثِ نیت یا بے محل استعمال سے سیئات بن جاتی ہیں۔ مثلاً غیبت میں سچ ہی بولا جاتا ہے غلط بیانی نہیں کی جاتی مگر پسِ پُشت عیب بیانی چونکہ موجبِ فتنہ وفساد ذات البین اور بے محل ہوتی ہے اس لئے یہی سچ قبیح بن جاتا ہے اور اس سے وہ جھوٹ ہزار درجہ بہتر ثابت ہوتا ہے جو مصالحت ذات البین کے لئے بولدیا جائے۔

پس سچ فی نفسہ حسن ہے مگر سلسلۂ استعمال قبیح ہو جانے سے وہ بھی قبیح ہو جاتا ہے۔ پس فضائل ہوں یا احکام اپنے حسن وقبح میں اپنے کلیات ونظریات کے حسن وقبح کے تابع ہوں گے خود ان کا ذاتی حسن وقبح معتبر نہ ہوگا کہ صرف اُسے ہی اثباتِ مدعا کی کافی دلیل سمجھ لیا جائے۔

ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ جزئیات جمع کر کے نقطۂ نظر بنانا یا کلیہ اور اصول قائم کرنا فہم اور ذوق کے تابع ہوتا ہے اس لئے نظریہ کی خوبی وخرابی درحقیقت ذوق ووجدان کی صحت وسقم کے تابع ہے۔ اگر مذاق ہی سلیم یا شرعی نہ ہو اور وہ ذہنیت ہی مستقیم نہ ہو جس سے نظریات اُبھرتے ہیں، بلکہ شرعی حیثیت سے زیغ اور کجی لئے ہوئے ہو تو ظاہر ہے کہ نظریات اور استنباط کردہ اصول بھی اُسی زیغ اور کجی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے نکلیں گے اور اس سے پیدا شدہ یا حکم کردہ تمام جزئیات وفرعیات اسی ایک جامع فیصلہ سے غلط ٹھہر جائیں گی کہ ان کا کلیہ اور نظریہ اور اُن نظریات میں سمایا ہُوا ذوق غلط اور ٹیڑھا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس نقطۂ نظر بنانے والی قوت یعنی ذوق اور ذہنیت کی اصلاح وتقویم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اور اسی اصلاحی عمل کا نام تزکیہ رکھ کر اُسے نبوت کے فرائض چارگانہ میں سے ایک اساسی اور بنیادی فریضہ قرار دیا ہے۔

حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السّلام نے بنائے کعبہ کے وقت اپنی ذریت کو دینی ودنیوی صلاح وفلاح کے لئے ایک عظیم الشّان رسول مبعوث کئے جانے کی دُعا مانگتے ہوئے یہی چار باتیں تلاوتِ آیات، تعلیمِ کتاب، تلقینِ حکمتہ اور تزکیۂ نفوس بطورِ فرائضِ رسالت اللہ سے مانگی تھیں جن میں سے آخری بات جو اوّل کی تین باتوں کے لئے اساس وبنیاد ہے یہی تزکیہ ہے جسے طلب فرمایا تھا کیونکہ اس کے بغیر دل کی درستی ہو ہی نہیں سکتی جو نقطۂ نظر اور نظریات کے لئے نقطہ آغاز ہے۔

پس اس تزکیہ کا حاصل اصلاحِ قلب اور اصلاحِ قلب کے واسطہ سے اصلاحِ اخلاق اور اصلاحِ اخلاق کے واسطہ سے اصلاحِ ذوق وذہنیت ہے تاکہ ذہنِ انسانی درست ہو کر فہم، ذوق اور دل ودماغ کا رُخ سیدھا ہو جائے اور انسان ہر مسئلہ کو اُسی کے رنگ میں دیکھنے کا اہل ہو جائے نہ کہ اپنے نفسانی رنگ میں پرکھنے کا، جو اس پر ماحول یا عوارض وغیرہ کے سبب سے چڑھا ہُوا ہو۔ پس نہ تو مفکّر کا نقطۂ نگاہ پھرا ہُوا ہو کہ دیکھ ہی نہ سکے، نہ بھینگا ہو کہ ایک کے دو دیکھنے لگے اور نہ ناقص ہو کہ دو کو ایک دیکھنے کا خوگر ہو جائے۔ بلکہ جو کچھ ہو جتنا ہو اور جیسا ہو وہی بعینہٖ دیکھے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْاَشْیَاءَ کَمَا ھِیَ۔

حاصل یہ کہ محض اس کا ارادہ اور نیت ہی مسلمان نہ ہو بلکہ وجدان بھی مسلمان بن جائے کہ جو کچھ بھی وہ کتاب وسنت سے سمجھے اور دیکھے صرف اسلامی ذوق سے سمجھے اور دیکھے نہ کہ منکرانہ اور ملحدانہ ذہن سے۔ مثلاً ان ہی قرآنی آیات کو مشرکانہ ذوق وذہنیت سے سمجھا جانے لگے تو ان کا رنگ اور ہوگا۔ نصرانی ذوق سے دیکھا جائے تو رنگ دوسرا ہوگا۔ یہودی رنگ سے دیکھا جائے تو رنگ دگرگوں ہوگا۔ آیاتِ قرآنی ہر صورت میں وہی رہیں گی۔ مگر ان کے مضامین اور مقاصد کی نوعیت کچھ سے کچھ ہو جائے گی اور ہر رنگ میں عوام کو آیاتِ قرآنی کا نام لے کر مبتلائے فریب رکھا جاسکے گا۔

(پھر اسی طرح مسلم نما جماعتوں کے مکاتیبِ خیال اور نقطۂ ہائے نظر جداجدا ہیں جو اسی ذوق ووجدان کے تفاوت سے متفاوت اور بدلے ہوئے ہیں۔ معتزلہ کا رنگِ فہم اور ہے اور قدریہ کا اور خوارج کا ذوقِ فہم اور ہے اور روافض کا اور۔ اس لئے بمقدارِ زیغ واستقامت اُن کے ذوق ووجدان کا صحت وسقم بھی متفاوت ہے۔ ان وجدانوں سے نکلے ہوئے افکار ونظریات بھی متفاوت ہیں اور ان نظریات کے تحت آیات وروایات سے اخذ کردہ معانی ومطالب بھی متفاوت ہیں جن میں زمین آسمان کا فرق وتفاوت ہے۔ مگر قرآن کا نام ہر جگہ یکساں ہے اور اسی کی امامت کے نام پر لوگوں کو ان نظریات وحکمیات کی طرف بُلایا جاتا ہے) اب ظاہر ہے کہ ان میں سے جس کے نظریات کو بھی غلط کہا جائے گا اور جو بھی کہے گا وہ آیاتِ قرآنیہ کی تغلیط نہیں کرے گا بلکہ اس طبقہ اور فرقہ کے فہم پر حکم لگائے گا اور یہی حکم انجامِ کار اُس طبقے کے ذوق اور

وجدان پر ہوگا نہ کہ آیات پر۔ پس اس کے ذوق کے غلط ہونے کی وجہ سے نظریات کو غلط، اور ان نظریات سے استخراج کردہ مسائل کو غلط کہا جائے گا نہ کہ آیات وروایات کو۔ اس لئے کسی کے پیش کردہ نظریات پر غور وفکر کرنے کے سلسلہ میں اس کے ذوق ووجدان اور ذہنیت سے قطع نظر نہیں کیا جاسکتا۔

یہ ظاہر ہے کہ ذوق ووجدان کی تربیت کا طریقہ سوائے اربابِ ذوق و وجدان کی معیت اور کثرتِ ملازمت کے دوسرا نہیں ہوسکتا جس کے لئے استنادِ خلف اور شہادتِ سلف ہی سب سے بڑی حجت اور علامت سمجھی گئی ہے، اسی لئے ہر عالم کے علم پر حکم لگانے کے لئے اس کا سلسلہ سند اور اس کے اساتذہ کے دین وعلم کی نوعیت معلوم کی جاتی ہے اور یہ سلسلۂ سند ہی اس عالم کے علم کی صحت وسقم کی سب سے بڑی شہادت ہوتی ہے۔ صحابہ کے صحتِ ذوق کی ضامن صحبتِ نبویؐ اور ذاتِ بابرکات سے انصباغ اور آپ کے ساتھ استناد ہے جس نے مشرکانہ ذوق نکال کر ان میں موحدانہ ذوق ومعرفت پیدا کیا۔ ان کے قلوب کا راستہ سیدھا کیا، جس سے اُن کا نقطۂ نگاہ ہر کجی اور زیغ سے پاک ہو کر خالص استقامت کی راہ پر آگیا اور وہ ہر مسئلہ قرآنی وحدیثی کو باقوالِ وَحْلہ اسی کے رنگ میں سمجھنے کے اہل اور عادی ہوگئے۔

تابعین کے لئے صحابہؓ سے استناد وانصباغ اور ان کی صحبت ومعیت باعث تربیتِ ذوق ثابت ہوئی۔ تبع تابعین کے لئے تابعین سے استناد وملازمت اور صحبت یافتگی اساس استقامت ثابت ہوئی۔ حتیٰ کہ اسی طرح بعد کے قرون میں آج کے دور تک استقامتِ ذوق کے لئے اہلِ ذوق ووجدان کی سندِ

معیتِ و ملازمت اور صحبت ہی سلامتیٔ ذہن و ذوق کی بنیاد ثابت ہوتی رہی ہے جس سے رنگ پکڑنا اور منصبغ ہو جانا ہی صحتِ ذوق کا ضامن رہا ہے۔ جیسا کہ اس کے بالمقابل اربابِ فتنہ میں اس سند و شہادت سے گریز، اہل اللہ کے اقوال و مذاق کی پیروی سے پہلوتہی، اہلِ دل کی معیت و ملازمت سے انقطاع، اہلِ حال کے احوالِ صادقہ سے رنگ نہ پکڑنا، اپنے ذاتی فہم و عقل پر غرور و گھمنڈ کرتے ہوئے سابقین کے فہم کو اپنے فہم کے لئے کسوٹی نہ سمجھنا یا بالفاظِ دیگر اُن کے فہم سے اپنا فہم نہ بنانا ہی اساسِ فہم سمجھا گیا ہے اور فہم کی جگہ غرورِ فہم پر قناعت کر لی گئی ہے۔ اس لئے مسائلِ فہمی میں ان کا وہی ذہن و ذوق امام رہا جو تربیت سے عاری، رنگِ انقیاد سے خالی اور صبغۃ اللہ سے کورا رہتا آیا ہے اور جس میں روحانی معرفت کے بجائے جبلّی اور نفسانی خیالات، گرد و پیش کے حالات اور وقت وقت کے محرکات سے ذہنی مرعوبیت کے جذبات بھرے ہوئے رہ جاتے ہیں جو اس نا تربیت یافتہ ذہن کی پیداوار اور نفس کے اختراعات ہوتے ہیں۔ مگر غرورِ فہم سے ان کو مدلولاتِ قرآن و حدیث سمجھ لیا جاتا ہے تا آنکہ ان ہی ناہموار جذبات سے نظریات اور نقطہ ہائے نظر اُبھرنے لگتے ہیں جن سے جزئیات فہمی کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ اس لئے وہ جزئیات خواہ قرآنی ہی کیوں نہ ہوں مگر ان غلط رَو جذبات و افکار کے سانچے میں ڈھلنے کے بعد اس لئے قابلِ قبول نہیں رہتیں کہ اُن کے وہ مخترعہ اصول ہی قابلِ رَد ہوتے ہیں جو زیغ آمیز فہم و ذوق سے اخذ کئے جاتے ہیں۔

پس بحث و نظر اور نقد و تبصرہ کے وقت اصل میں یہی غلط نظریات رَد

کئے جاتے ہیں نہ کہ قرآنی جزئیات۔ گو بظاہر رَدّ و قبول کا عمل ان پر جاری نظر آتا ہے۔ اس لئے استدلال میں قابلِ توجہ وہ جزئیات نہ ہوں گی جو پیش کی گئی ہوں بلکہ وہ اصول و نظریہ اور اس سے آگے وہ ذوق ہوگا جس سے یہ جزئیات ابھری ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکینِ عرب اور یہود و نصاریٰ کے سامنے توحید رکھی حالانکہ وہ نفسِ توحید کے منکر نہ تھے۔ نبوت پیش کی حالانکہ وہ نبوت کو بھی مانتے تھے۔ مبدأ و معاد پیش کیا حالانکہ وہ اس کے بھی قائل تھے، مگر پھر بھی انہیں منکر و کافر کہا گیا اور اُن ہی عقائد کی دعوت دی گئی جن کے وہ کلیتہً منکر نہ تھے، محض اس لئے کہ وہ ان مسائل کو مشرکانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کے خوگر تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں مومنانہ اور مسلمانہ ذہنیت سے سمجھانا چاہتے تھے۔

بالفاظِ دیگر اُنہیں محض مسائل ہی سمجھانا نہیں چاہتے تھے بلکہ اُن کی ذہنیت اور ذوق و وجدان کو بھی تبدیل فرمانا چاہتے تھے تاکہ حقائق کا صحیح مفہوم ہمیشہ اُن کے ذہنوں میں اُترا کرے اور محض اُن کے ہاتھ پاؤں اور زبان ہی مسلم نہ ہوں بلکہ اُن کا دِل و دماغ اور ذہن و وجدان بھی مسلم بن جائے لیکن جب انہوں نے اُس سلسلہ ہی کو قبول نہ کیا جس کی یہ جزئیات تھیں اور اُس ذوق ہی کو نہ اپنایا جس سے یہ سلسلہ چلتا تھا تو وہ مسلم بھی نہ کہلائے، گو فی الجملہ وہ ان تمام مسائل کے قائل تھے۔

✲

مجھے معاف کیا جائے، اگر میں یہ عرض کروں کہ برق صاحب نے علمی قرآن اور کائناتی قرآن کی اس باہمی تطبیق کو دکھاتے ہوئے جن مسائل کی طرف رہنمائی کی ہے وہ کُل یا اُن میں سے بعض خواہ فی نفسہ صحیح بھی ہوں، مگر قابلِ تسلیم ہرگز نہیں ہیں۔ کیونکہ ان مسائل کو جس سلسلہ سے پیش کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں جس نقطۂ نظر کا ثبوت دیا گیا ہے اور اس نقطۂ نظر میں جس ذوق وذہن سے کام لے کر ان مسائل کا تجزیہ کیا گیا ہے وہ بظاہر غیر تربیت یافتہ اور خود اپنے ہی اختراعات کے دھوکہ میں آیا ہُوا ہے۔

(برق صاحب نے قرآن کو اس کی حقیقی تشریحات سے الگ کر کے محض زورِ مطالعہ اور محض اپنے ہی ذہنی رُخ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، بلحاظ نقطۂ نظر انہوں نے قرآن کو تقویٰ و طہارت، اخلاق و روحانیت، زہد و عبادت، خشوع و انابت، اتباعِ سنّت و اقتضائے آثارِ سلف اور خلافتِ الٰہی کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کے بجائے عصری بُنیادوں، فلسفہ و سائنس، معاشیات، اقتصادیات، عمرانیات و سیاسیات، تعیش و تفریح اور رسمی جاہ و اقتدار یعنی ملوکیت و سلطنت اور موجودہ دُنیا کے خالص مادّی افکار و نظریات کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا تو اُنہیں ہر آیت میں سے خالص مادّیت کا ایک سیلاب اُمنڈتا ہُوا نظر آیا اور آج کی متمدّن اور برعکس نام نہاد مہذّب اقوام کی عنصریاتی ترقی ہی اُن کی مرعوب نگاہ میں قرآنی ترقی اور اُس کا نصب العین دکھائی دینے لگی۔ حتیٰ کہ یہ مادی کھود کرید اور اُس کے موالید دُخان و بخارہ، گیس و برق، ریل و تار، طیارہ و سیارہ اور فون و لاسلکی وغیرہ۔ پھر ان وسائلِ نقل و حمل اور اسبابِ

علم و خبر کے وسیلہ سے ایک طرف اسباب زینت و تعیش کی توسیع سے دُنیا میں ہوسناکی عیاشی، حرص و آز، بد اخلاقی و سیاہ کاری اور صد نوع فسق و فجور کی وسعت و کثرت اور دوسری طرف اسبابِ تباہی و ہلاکت اور مہلک آلاتِ حرب و ضرب، گن اور بم، ایٹم اور گیس و بارود اور تیزاب وغیرہ کی تیاری سے استبدادی طور پر اقوامِ عالم پر زور آزمائی، غلام سازی، قتل و غارت گری، اعلانیہ جور و جفا اور عالمی امن و سکون کی بربادی کی بہتات اور پھر یہ سب کچھ بنامِ امن و صلاح، یعنی کُھلی عیاری و مکاری، ڈپلومیسی، نفاق اور باہمی بے اعتمادی کی وسعتِ ہمہ گیری۔ خلاصہ یہ کہ اس مکر و فریب کی راہ سے ان غیر معتدل اور از حدود رفتہ عیاشیوں اور حد سے گزری ہوئی تباہ کاریوں کے پردے میں بہیمیت کا غلبہ، درندگی کا زور، اور شیطنت کا استیلا دہی (جو انِ اسبابِ تعیش و ہلاکت کی افراط کا قدرتی نتیجہ ہے) برق صاحب کے نزدیک نبوت و خلافت کی اصلی غرض و غایت ٹھہر گیا اور اس دنیاداری ہی کو انہوں نے ایمانداری قرار دے دیا۔ حالانکہ اُس کے مٹانے کے لئے تو انبیاء کی نبوّت اور خدا کی خلافت دُنیا میں آئی تھی۔)

پس موصوف نے اپنی برق رفتاری سے نبوّت و خلافت کی غرض و غایت ہی کو اُلٹ دیا اور قلبِ موضوع کے اس اُلٹ پھیر میں آکر ایک نکھرے ہوئے روحانی اور اخلاقی نصب العین کو خالص مادّی نصب العین بنا دیا۔

لیکن اس مادہ نقطۂ نگاہ کا نہایت ہی مہلک اور خطرناک نتیجہ ایک تو یہ نکلتا ہے کہ اسلام کا قرنِ اوّل اور صحابۂ مقبولین کا طبقہ معاذ اللہ سب سے زیادہ ضعیف الایمان

قلیل العلم اور محروم العمل قرار پاجاتا ہے جس نے منشائے قرآنی کے مطابق نہ ایک مشین بنائی نہ ایک انجن ہی ایجاد کیا۔ نہ دُخان و بخارے کلیں چلائیں۔ نہ خوبصورت چھری کانٹے ڈھالے۔ نہ کریم اور پاؤڈر تیار کئے۔ نہ چہروں کو گلگوں بنانے کے لئے غازے اور لوشن بنائے نہ آرائشی سامانوں کی تخلیق کی۔ نہ ہواؤں میں اُڑتے پھرے، نہ پانیوں میں بہتے دکھائی دیئے۔ نہ کسی نے مہلک آلات ایجاد کر کے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کا منٹوں میں صفایا کیا، نہ استعماری اغراض کے ماتحت دنیا میں جبر و استبداد اور ظلم و ستم پھیلایا۔ نہ سائنٹیفک آلات کی طاقت کے بل بوتہ پر قوموں کی غلام سازی کی۔ نہ اپنی استعماری اغراض کی خاطر زیردستوں کے کچلے ہوئے جذبات کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کی اور نہ ہی دُنیا کا سرمایہ سمیٹ کر آلاتِ لہو و لعب، باجے گاجے، سینما و تھیٹر، فواحش و منکرات کے مناظر، بے حیائی اور بے حجابی کے عُریاں نقشے دنیا میں رائج کر کے اپنی تجارت کو فروغ دیا۔

غرض برقؔ صاحب کے تجویز فرمودہ منشائے قرآنی کے مطابق نہ مشینی تمدن برپا کیا نہ بجلی سے بلڈنگیں جگمگائیں، نہ ڈامر کی سڑکوں پر موٹریں دوڑائیں اور نہ خود ہی ان تفریحات و تعیشات کی لائنوں پر دوڑے۔ اس لئے اسلامی اور قرآنی حیثیت سے قرنِ اوّل کی زندگی معاذ اللہ سب سے زیادہ ناکام اور اسلام سے بعید زندگی ہے۔

اِدھر اس کے برعکس جوں جوں قرنِ نبوت سے بُعد ہوتا گیا اُسی قدر یہ سائنٹیفک ترقیات بڑھتی گئیں گویا علمِ قرآنی ترقی کرتا گیا۔ فہمِ انسان تیز تر ہوتا

گیا اور عمل بالقرآن کا ذوق بڑھتا گیا۔ گویا نبوت کے قرن سے بعید ہونا ہی اُمّت کے حق میں رحمت ثابت ہُوا کہ سمجھ اور فہم صحیح ہو گئے اور لوگ ایمان داری کا صحیح صحیح مفہوم سمجھنے کے لائق ہو گئے اور قرنِ نبوت کی موجودگی میں اُمّت کو فہم اور علم اور عمل کے لحاظ سے حرمان و خسران کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ پس برق صاحب کے ان اختراعی مقدمات کا خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ قرنِ اوّل بلحاظِ علم و عمل معاذ اللہ شر القرون ثابت ہو گیا اور یہ آج کا شر القرون خیر القرون بن گیا۔ حالانکہ لسانِ پیغمبر پر خدائی دعوے یہ تھا کہ :۔

خَیْرَ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ۔	"زمانوں میں سب سے بہتر میرا زمانہ ہے، پھر وہ لوگ جو خیر القرون والوں سے متصل ہوں اور پھر جو اُن لوگوں سے متصل ہوں"

پس کلامِ نبوی میں تو عہدِ نبوت کا خیر و برکت اور اس کی وسعت و کثرت کی طرف اور زمانۂ مابعد میں رفتہ رفتہ اس خیر و برکت کا قلت اور ضعف کی طرف بڑھتے رہنا بتایا گیا ہے۔ مگر کلامِ برق سے قصّہ برعکس ثابت ہو رہا ہے۔ اُدھر کلامِ نبوی سے تو نبوت عالم کے لئے رحمت ثابت ہو رہی ہے اور کلامِ برق سے زحمت ثابت ہوئی۔ قرآن نے تو ایمانداری کا مفہوم علمِ نافع کے ساتھ حسنِ اخلاق اور فضائلِ اعمال قرار دیا تھا جس کا سرچشمہ نبی کی روحانیت ہے اس لئے قدرتی طور پر ایمانداری کی ترقی کا اعلیٰ ترین وقت تو زمانۂ نبوت اور اس سے قرب، اور اس کے تنزل کا وقت نبوت اور اُس سے ملحقہ زمانوں سے بُعد ہی ہو سکتا ہے۔ مگر کلامِ برق میں ایمانداری کا مفہوم دنیاداری یعنی تمدنی ترقیات

اور سائنٹیفک ایجادات ہیں جن کا سرچشمہ عقل معاش اور خالص مادّیت ہے اس لئے قدرتی طور پر ان کی مزعومہ ترقی تو عہدِ نبوت سے بُعد میں اور ان کی پستی یا ان کا وسیلۂ محض رہ کر سربلند نہ ہوسکنا نبوت اور اُس کے قریبی زمانوں ہی میں ہوسکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک اُمّتی کے کلام کو نبی کے کلام سے یہ بُعد اور نتیجۂ کلام میں نبوت سے یہ صریح معارضہ، نتیجہ ہے ذہن اور نقطۂ نظر کے نا تربیت یافتہ رہ جانے اور ذوق کو زیغ آمیز چھوڑے رکھنے کا، یہی نہیں بلکہ برق صاحب کے اس اصول پر سارے ہی انبیاء علیہم السّلام پر حرف آجاتا ہے۔ کیونکہ اُن کے دَور میں مادّی اور تمدّنی ترقیات تو کیا ہوتیں برپا شدہ ترقیات بھی فنا کے گھاٹ اتار دی گئیں۔ انہوں نے اپنے اپنے دَورِ خیر و برکت میں تمدّنی تعمقات اور عیشِ دُنیا کے گھڑے ہوئے تکلف آمیز نقشے اپنی پوری روحانی قوت سے مٹائے ہیں جن کو قائم کرنے میں مادّی مزاج اور فلسفی طبع لوگوں نے انتہائی کاوشِ دماغ اور مستعدی دکھلائی تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے کلدانیوں کی تمدّنی ترقیات پر پانی پھیر دیا تھا۔ جو بعض حیثیات سے آج کی تمدّنی ترقیات سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر تھیں اور لوگوں کو پھر سے اُسی سادہ تمدّن کی دعوت دی جس میں تکلفات اور افراطِ عیش کا وجود نہ تھا۔

موسیٰ علیہ السّلام نے فرعون اور فرعونیوں کا وہ ملکی اور شہری کرّ و فر ختم کرکے چھوڑا جس پر فرعون "اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ" کہکر فخر کیا کرتا اور انہیں اسی بے تکلف سادہ تمدّن پر لانے کی کوشش فرمائی۔

بنی اسرائیل جب بھی اس تمدّن کی تکلف آمیز رنگ رلیوں میں پڑے اور طبعی نتیجہ کے طور پر فساد فی الارض میں مُبتلا ہوئے۔ اُسی وقت اُن پر عذابِ خداوندی مسلّط ہُوا اور دوسری جابر قومیں بخت نصر، ٹیٹس رومی وغیرہ اُن پر مسلّط ہوگئے اور بنی اسرائیل کو محکوم اور غلام بننے کے سوا چارۂ کار باقی نہ رہا۔ اور بالآخر جب بھی متنبّہ ہو کر انہوں نے اُن تمدّنی تکلفات اور اُن کے خواص و آثار یعنی سرکشی اور طغیان کو خیر باد کہا اور اُسی سادہ اخلاقی تمدّن پر آئے جو ہمیشہ سے انبیاء کا تمدّن رہا ہے وہ پنپنے لگے اور از سرِ نو اُن کا گیا ہُوا وقار و اقتدار باز یافت ہُوا۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے دَور کے دو عظیم الشان مادّی تمدّنوں یعنی رومی اور ایرانی کرّ و فر اور عمرانی عجائبات کو مٹا دینے کا پرداز ڈالا اور اُن کے مِٹ جانے کی پیشین گوئیاں فرمائیں جن کے مطابق آپؐ کے پاکباز صحابہ نے عین منشائے نبوی کے مطابق اپنی فتوحات سے اُن تکلف آمیز تمدّنوں اور ان کی سرپرست حکومتوں کو درہم برہم کر ڈالا اور وہ سادہ تمدّن قائم کر دیا جو مقاصدِ عبودیت میں حارج نہ ہو۔ کسریٰ کے وہائٹ ہال کے بے نظیر سامانوں مافوق العادت سیم و زر کے ظروف و تاج اور اعلیٰ اعلیٰ نمونوں کے انمول قالینوں وغیرہ کو دیکھ کر جو بسلسلۂ مالِ غنیمت مسجدِ نبویؐ میں لائے گئے، فاروقِ اعظمؓ رو پڑے اور فرمایا کہ یہی وہ سامانِ تعیش ہے جس کی بدولت فارسی قوم آج مسلمانوں کی محکوم اور مفتوح بنی۔ ڈر ہے کہ یہ سامان کہیں ہمیں بھی مبتلائے تعیش کرکے کسی قوم کا مفتوح اور غلام نہ بنا دے۔ ظاہر ہے کہ

فاروقِ اعظم کو یہ ڈر مُلّائیت کی سادگی سے نہ تھا بلکہ اسی معادنِ ارضیہ ، دفائنِ جبال اور خزائنِ بحار کے رنگین سامانِ تمدّن سے تھا جس کے سائنٹفک نمونے اُس وقت قیصر و کسریٰ نے دُنیا کو دکھلائے تھے اور آج دانایانِ فرنگ پیش کر رہے ہیں -

خلفائے راشدین یا ملوکِ عادل کے زمانوں میں تمدّن سادہ اور اخلاقی رہا سامانِ عیش ونشاط کم سے کم اور سامانِ ہلاکت و تباہی تقریبًا مفقود رہا۔ اس لئے اسلامی فتوحات اور دائرۂ خلافت کی وسعت و قوت بھی اُسی دَور کا طرۂ امتیاز ہے۔ جوں جوں عجمیت اور بالفاظِ دیگر قیصریت و کسریت اور بالفاظِ واضح مادیت اور اُس کی تعیش آفریں صورتیں پیدا ہوتی رہیں، اخلاقی ترقیات کے قدم سُست پڑتے گئے اور ہجوم و اقدام کے بجائے کھانے، بانٹنے پر خانہ جنگیاں بڑھتی گئیں اور مسلمان اوّلاً من حیث المذہب اور پھر من حیث القوم رُو بہ انحطاط ہوتے گئے۔

پانسو برس بعد اسی تعیش اور تمدنی تکلّف نے عربوں کی دولت ختم کر دی جو پھر لَوٹ کر نہیں آئی اور دوسرے پانسو برس کے بعد بتدریج ترکوں کی دولت لُوٹ لی جو پھر اپنی اصلیت پر نہیں لَوٹی اور بالآخر تیسرے پانچ سو کے آغاز میں اسلامی قوم نصرانی اقوام کی سنگینوں کے نیچے آنی شروع ہوگئی جس سے آج تک بھی اُسے چھٹکارا نصیب نہیں ہُوا ہے۔ گویا عربوں اور ترکوں نے جن قوموں سے سائنٹیفک ترقیات اور تمدنی تکلّفات کا ورثہ پایا تھا بالآخر اُن ہی کی غلامی اور محکومی بھی ورثہ میں پالی۔ اور اب جن اقوام نے عربوں اور ترکوں سے رسمی اور نمائشی تمدن و

ترقی کا ورثہ حاصل کیا تھا وہ بھی آخر کار اُن ہی کے انجام کی طرف بڑھتی نظر آرہی ہیں۔ کسی کی چودھراہٹ ختم ہوئی، کسی کا ملک گیا، کسی کے اقتصادیات گئے اور کوئی خود سے گئی۔ غرض کہ یہ مقدمات ہیں سب کچھ چلے جانے کے۔

حاصل یہ ہے کہ اقوام کا حدوث و بقاء بالآخر اسی سادہ معاشرت اور بے تکلّف تمدّن سے وابستہ ہے جو اِن سائنٹیفک ترقیات و تعیشات اور نام نہاد ایجادات کی آلائشوں سے پاک ہو اور بجائے ہوسِ اقتدار اور حرصِ تعیش کے اخلاقی اور روحانی قوتوں پر قائم ہو۔ شاید برق صاحب کے نقطۂ نگاہ سے ان انبیاء کی بعثت اور اُن کے صحابہ کا اُٹھان معاذ اللہ ایمان داری اور اس کے شعبوں کی تخریب کے لئے تھا ؟ اگر ایمانداری یہی دُنیاداری اور اُس کی تمدنی ترقیات تھیں جنہیں مادّہ کی توڑ پھوڑ سے بشابہتِ حق تعالیٰ حاصل کیا گیا تھا تو اُن نائبانِ الٰہی کو اس ایمانداری کے مٹانے اور اس کی جگہ معاذ اللہ مُلّائیت کی ناواقفی، جہالت اور منشائے الٰہی سے بے خبری کو قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟

غور کیا جائے تو یہ وہی نقطۂ نظر اور ذوق و ذہنیت کا فرق ہے - برق صاحب جس ذوق سے قرآن کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں اُس کی رُو سے یقینًا اسلام کا چہرہ معکوس نظر آتا اور اس کے محاسن کا معائب نظر پڑنا ناگزیر تھا۔ انہوں نے اپنی مرعوبانہ ذہنیت کی وجہ سے قرآن کو ملحدانِ یورپ کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا تو اُنہیں مہلک دنیاداری میں ایمان داری نظر آئی۔ اگر وہ خیر القرون کے نقطۂ نظر سے دیکھتے تو انہیں ایمانداری انبیاء کی سادہ معاشرت،

تکلفات اور تلذذات سے مبرا زندگی، اور خدا پرستانہ روحانیت و اخلاقیت پر نظر پڑتی اور اُن کے کلام سے اسلام کا قرنِ اوّل اس طرح ضعیف الایمان، قلیل العلم اور محروم العمل ثابت نہ ہوتا۔ لیکن اگر قرنِ اوّل کی مقدس شخصیتوں اور اُس پاک دور کی خصوصیتوں سے الگ ہو کر خالص اصولی حیثیت سے بھی برق صاحب کی نام نہاد ایمان داری کا یہ نقشہ قرآن کریم پر پیش کیا جائے تو اُس کی کھلی کھلی تصریحات سے بھی یہ آج کی دُنیاداری ایمان داری ثابت نہیں ہوتی اور نہ آج کے مُہلک تمدن کی یہ گرم بازاری منشائے قرآنی سے کوئی جوڑ ہی کھاتی ہے۔ بلکہ قرآنی آیتیں سرے سے ہی اس نقشہ کو مٹا ڈالنے کا پروگرام پیش کر رہی ہیں۔ چنانچہ قرآن نے اس مادّی دُنیا اور خالص مادّی گھروندے کو مطلوب یا مقصودِ زندگی باور کرانے کے بجائے حقارت آمیز عنوانوں سے اُسے رد کرتے ہوئے ایمان داروں کو اس سے ہٹانے اور بیزار بنانے کی سعی کی ہے۔ کہیں اُس نے پوری دُنیا کو جس میں برق صاحب، کے فرمودہ گیس و بجلی اور ایجادات کے نئے سے نئے نمونے سب شامل ہیں، متاعِ قلیل کہہ کر اُس کی تحقیر کی جس کا مقصد اس سے بے التفات بنانا ہے۔ فرمایا :-

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ وَ الْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی ۔

"اے نبی کہدو کہ دُنیا کا سامان قلیل ہے اور آخرت متقی لوگوں کے لئے بہترین سامان ہے۔"

کہیں پُوری دُنیا کو لہو و لعب اور بے حقیقت کھیل کود بتایا جس پر بے عقل اور طفلانہ مزاج والے ہی ریجھ سکتے ہیں۔ فرمایا :-

اِعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَہْوٌ (سورہ محمد)

"یاد رکھو دنیا کی زندگی کھیل کود ہے"۔

کہیں پوری دُنیا کو دھوکہ کی ٹٹی فرمایا جس پر سبک دماغ ہی لٹو ہو سکتے ہیں۔ فرمایا :-

وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۔

"دنیا کی زندگی دھوکہ کی ٹٹی ہے۔"

کہیں پوری دنیا کو آفتوں سے ماری ہوئی کھیتی کہا جس کا آغاز سرسبز اور انجام اجاڑ ہو۔ فرمایا۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا کَمَآءٍ اَنْزَلْنٰہُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِہٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا یَاْکُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ حَتّٰی اِذَا اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَہَا وَازَّیَّنَتْ وَظَنَّ اَہْلُہَا اَنَّہُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْہَا اَتٰہَا اَمْرُنَا لَیْلًا اَوْ نَہَارًا فَجَعَلْنٰہَا حَصِیْدًا کَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ۔

"دُنیا کی زندگی کی مثال اُس پانی جیسی ہے جو آسمان سے برس کر زمین کی پیداوار میں شامل ہو گیا جس کو انسان اور حیوانات کھاتے ہیں حتیٰ کہ جب زمین کی پیداوار پورے آب و تاب کو پہنچ گئی اور آراستہ پیراستہ ہو گئی اور لوگ یہ سمجھنے لگے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں تو ہمارا حکم (عذاب) رات یا دن کیوقت آپہنچا، پس وہ تمام پیداوار نیست و نابود ہو گئی گویا کل وہ موجود ہی نہ تھی۔"

کہیں پوری دنیا کے حاصل (زر۔ زمین۔ زن) کو صورتِ بے حقیقت، نمائشِ بے روح، نمودِ بے بود، اور محض ظاہری ٹیپ ٹاپ بتلاتے ہوئے اُسے شہوت پرستوں کا محبوب بتایا۔ فرمایا :-

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّہَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِیْنَ وَالْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَۃِ

"آراستہ کی گئی ہیں لوگوں کے واسطے عورتیں، اولاد اور مال و دولت،

من الذهب والفضة والخیل المسومة والانعام والحرث ذٰلک متاع الحیٰوۃ الدنیا واللہ عندہ حسن المآب ۝

"سونے چاندی، نشان لگائے ہوئے گھوڑے اور جانوروں کی محبت یہ ہے دنیا کا سامان، اللہ کے نزدیک ہی ہے حسنِ انجام ۔"

کہیں پوری دُنیا کی ان ظاہری بہاروں اور نمائشی سرسبزیوں پر راضی اور مطمئن ہوجانے کو مجرمانہ غفلت اور انجام کی بدحالی بتلایا - فرمایا -

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ۔

"جو لوگ ہم سے ملنے کی اُمید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہوگئے اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے، اُن اعمال کی پاداش میں جن کے وہ مرتکب ہوتے ہیں ۔"

کہیں لذات دنیا میں منہمک رہنے والوں کے بارے میں جاہل اور احمق ہونے کی تلمیح کی - فرمایا :-

ذَرْهُمْ یَاْکُلُوْا وَیَتَمَتَّعُوْا وَیُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ ۔

"ان کو چھوڑ دو، کھانے پینے دو، مزے اُڑانے دو، باطل آرزوئیں ان کو خدا سے غافل بنائے رکھیں گی مگر وہ ضرور جان جائیں گے ۔"

کہیں دنیا کی مالی فراوانی اور افزائش کو یا باصطلاح عوام ننانوے کے پھیر کی خاصیت کو گرفتاریٔ لہو ولعب، ، یا بد انجام مشاغل میں پھنس جانا بتلایا - فرمایا -

اَلْهٰکُمُ التَّکَاثُرُ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۔

"غفلت میں رکھا تم کو بہتات کی حرص نے یہاں تک کہ جا دیکھیں قبریں ۔"

کہیں دُنیا کے مالِ جمع، اکتناز، ذخیرہ بازی، اور آج کی اصطلاح میں سرمایہ داری پر عذابِ الیم کی دھمکی دی - فرمایا -

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۔

"جو لوگ سونے چاندی کو جمع کر کے رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، اے نبی! تم اُن لوگوں کو دردناک عذاب کی بشارت سنا دو ۔"

کہیں بے تحاشا کھانے پینے اور عیشِ دنیا میں غرق ہوجانے کو بہائم سے تشبیہ دے کر اُن کا انجام جہنم بتلایا - فرمایا :-

الذین یأکلون کما تأکل الانعام والنار مثوی لهم ۔

"یہ لوگ اسطرح کھاتے پیتے ہیں جسطرح جانور کھایا پیا کرتے ہیں، ان لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے ۔"

کہیں دنیا کے باغ و بہار کی بے ثباتی دکھلا کر اور اُس کے پجاریوں کی بدانجامی دکھلا کر عبرت دلائی اور اُس سے بیزار ہونے کی ہدایت فرمائی ہے - فرمایا :-

کَمْ تَرَکُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ۝ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ کَرِیْمٍ ۝ وَّنَعْمَةٍ کَانُوْا فِیْهَا فٰکِهِیْنَ ۝ کَذٰلِکَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ ۝ فَمَا

"کس قدر باغات، چشمے اور کھیتیاں اور عمدہ عمدہ مقامات اور نعمت، جس میں وہ لوگ مزے اُڑا رہے تھے چھوڑ گئے، اسی طرح ہم نے اُس زمین کا وارث دوسری قوم کو بنا دیا

بکت عَلَیۡھِمُ السَّمآءُ والارض وما کانوا مُنظَرِینَ ○

جن پر نہ زمین روئی اور نہ آسمان اور نہ اُن کو کسی قسم کی مہلت دی گئی "

کہیں اپنے پیغمبر پاک کو ہدایت فرمائی کہ دُنیا کی اس چند روزہ ٹیپ ٹاپ کی طرف کوئی ادنیٰ التفات نہ کریں کہ یہ فتنہ اور بلا ہے ۔ بلکہ صرف طلبِ آخرت اور فکرِ عاقبت میں منہمک رہیں ۔ فرمایا :-

ولا تمدّنّ عینیک الیٰ ما متعنا بہ ازواجاً منھم زھرۃ الحیوٰۃ الدُّنیا لنفتنھم فیہ ورزق ربک خیر وابقیٰ ۔

" مت پھیلاؤ اپنی دونوں آنکھوں کو اُن چیزوں کی طرف جو ہم نے اُن لوگوں کو دُنیاوی زندگی میں عطا کی ہیں ، اس لئے کہ یہ سب کچھ اُن کی آزمائش کے لئے ہے ، تیرے رب کا رزق بہتر اور ہمیشہ رہنے والا ہے "

یہ دُنیا کے اُس حصّہ کی مذمت تھی جس کا تعلق باہ اور شہوت سے ہے ، بعینہٖ اسی طرح دُنیا کے اُس حصّہ کی بھی قرآن نے مذمّت کی جس کا تعلّق جاہ اور نخوت سے ہے ۔ یعنی یہاں کی تمکنت وقوت کی عددی اکثریت اور اولاد کی کثرت بھی خدا کی طاقت کے سامنے ہیچ ہے ۔ اس لئے مال کو مقصودِ زندگی سمجھ کر اُس میں عمرِ عزیز گنوا دینا بالآخر حرمان وخسران کا باعث ہے ۔

اسی لئے قرآن مجید نے کہیں دُنیا کی مادی شوکت وقوت ، فراوانیٔ مال ودولت ، اولاد وافراد کی کثرت ، اور نفسانی لذّت وفرحت کے سمیٹتے رہنے کو دُنیا وآخرت میں بربادیٔ عمل اور ناقابلِ تلافی گھاٹا قرار دیا ۔ فرمایا :-

کالذین من قبلکم کانوا اشدّ منکم قوۃ واکثر اموالاً واولاداً فاستمتعوا بخلاقھم فاستمتعتم بخلاقکم کما استمتع الّذین من قبلکم بخلاقھم وخضتم کالذی خاضوا اولٰئک حبطت اعمالھم فی الدُّنیا والاٰخرۃ واولٰئک ھم الخاسرون ○

" جس طرح تم سے اگلے لوگ زیادہ تھے تم سے زور میں اور زیادہ رکھتے تھے مال اور اولاد ، پھر فائدہ اُٹھا گئے اپنے حصّہ سے پھر فائدہ اٹھایا تم نے اپنے حصّہ سے جیسے فائدہ اٹھا گئے تم سے اگلے اپنے حصّہ سے اور تم بھی چلتے ہو اُن ہی کی سی چال ، وہ لوگ مٹ گئے اُن کے عمل دُنیا میں اور آخرت میں اور وہی لوگ بڑے نقصان میں ہیں "

کہیں ان مادی شوکت وقوت کے نظر فریب سامانوں (مثلاً ٹینک ، ایروپلین ، بم ، گیس اور توپ وتفنگ وغیرہ) اور عددی اکثریت کے لشکروں پر بمقابلۂ طاقتِ اخلاق وروحانیت بھروسہ کر بیٹھنے کو انتہائی ضعف اور انجام کی ہلاکت قرار دیا ۔ فرمایا ۔

وکم اھلکنا قبلھم من قرن ھم احسن اثاثاً ورئیا قل من کان فی الضّلٰلۃ فلیمدد لہ الرّحمٰن مدّاً حتی اذا رأوا ما یوعدون امّا العذاب وامّا الساعۃ فسیعلمون من ھو شر مکاناً واضعف جنداً ○

" ان سے پہلے ہم نے کتنے ہی لوگوں کو ہلاک کر ڈالا جو ساز وسامان اور حسنِ ظاہری رکھتے تھے ، کہدو کہ جو لوگ گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں خدا انکی رسّی دراز کر دیتا ہے ، یہاں تک کہ وہ اپنی آنکھوں دیکھ لیتے ہیں اُس چیز کو جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے ، عذاب یا قیامت ، پس وہ لوگ جانیں گے کہ کون از روئے مقام کے بدترین اور قوت وطاقت کے لحاظ سے کمزور رہے "

کہیں دُنیا کے ان رسمی رضاکاروں اور مددگار جتھوں کی محیر العقول عددی اکثریت کا کھوکھلا پن ظاہر فرماتے ہوئے ان طاقتوں پر بھروسہ رکھنے والوں کو ناعاقبت شناس اور بالآخر بے یار و مددگار رہ جانے والا بتلایا۔ فرمایا۔

حتی اذا راؤا ما یوعدون فسیعلمون	"یہاں تک کہ جب دیکھیں گے جو وعدہ ہوا تھا اُن
من اضعف ناصرًا و اقل	سے سو تب معلوم کریں گے کس کا کمزور ہے مددگار
عددًا ۔	اور کس کا کم ہے عدد"۔

بہرحال عیش و نشاط کے وافر سامان ہوں یا قوت و شوکت کے مضبوط وسائل اسبابِ رزم ہوں یا وسائلِ بزم، دربار سے متعلق کر و فر ہو یا بازار سے متعلق سیم و زر، جو آج کی نہیں، ہمیشہ کی دُنیا پرست اقوام کا سرمایۂ سرور و غرور رہا ہے اور آج اسی سرور و غرور کو تلبیس آمیز عنوانات سے دین و ایمان اور خلافت و اطاعت پکارا جا رہا ہے، قرآن کے نزدیک یہ دونوں ہی شعبے بذاتہٖ لایعباء بہ اور انتہائی بے حقیقت ہیں جنہیں مقصودِ زندگی یا دین و آئین سمجھنا ناعاقبت اندیشی اور ہلاکت کوشی فرمایا گیا ہے۔

پھر اس بارہ میں قرآن نے محض اصولی ہی دعویٰ نہیں کیا بلکہ واقعات کی شہادت سے جگہ جگہ اقوامِ سابقہ کی تباہی کی مثالیں بھی پیش کی ہیں کہ چند روزہ بہاروں میں پڑ کر وقتی عیش و لذت کے سرور و غرور میں مبتلا ہو کر، تعیش کی افزائش کے لئے دماغی کاوشوں سے اختراعات و ایجادات میں غرق ہو کر بڑی بڑی جابر قومیں آن کی آن میں کس طرح برباد کر دی گئیں کہ آج ان کا کوئی نام و نشان بتلانے والا بھی نہیں۔ قومِ نوح طوفان کے تھپیڑوں سے، قومِ عاد آندھیوں کے

جھکڑوں سے، قومِ ثمود ہولناک گرج اور غیبی چنگھاڑ سے، قومِ شعیب آسمان کی آتش باری سے، قومِ لوط فضا کی سنگباری اور بستیوں کے اُلٹ دیئے جانے سے، قومِ ابراہیم سلبِ نعمت و ملک سے، قومِ فرعون قلزم کی موجوں سے اس طرح بے نشان کر دی گئیں کہ نہ اُن پر آسمان رویا نہ زمین۔

مصریوں کی سائنٹیفک ترقیات، بے نظیر باغات، خوشنما آبشار، سرسبز کھیتیاں، دلفریب سینریاں، اسبابِ عیش و نشاط، فرعونی دماغی کے مجوزہ سربفلک منارے جن کی مدد سے وہ آسمان کے دروازوں سے قریب ہو کر موسیٰ علیہ السلام کے خدا سے مقابلہ کا حوصلہ کر رہا تھا، اُن کے لئے کچھ بھی کارآمد ثابت نہ ہوئے اور یہی ساری سائنٹیفک ترقیات فرعون اور فرعونیوں کے حق میں موجبِ ہلاکت و تباہی بنیں۔ بالآخر نام اور کام اگر باقی رہا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی سادگی و بے تکلفی کا، جسے برق صاحب خالص مُلّائیت قرار دیتے ہیں۔

عاد و ثمود کو ان کی سائنسی ترقیات اور فن کاریوں کی بے مثال تعمیر و ترقی قوم عاد کو فن انجینیری کے تحت نادرِ روزگار سربفلک بلڈنگیں اور قوم ثمود کو پہاڑوں سے تراشی ہوئی قلعہ بند عمارتیں اور منزل در منزل تعمیریں اُس عذابِ خداوندی سے نہ بچا سکیں جو نمائشی بہاروں میں غرق ہو جانے کے سبب اُن پر آیا۔ اسی لئے قرآن نے اُن کے اُن خالص مادیت کے شاہکاروں اور اخلاق و روحانیت سے ہٹے ہوئے کارناموں کو مقصودِ زندگی قرار دے لینے کو نفرت و حقارت سے یاد کیا ہے جس کا مفہوم قطعاً یہ نہیں نکلتا

کہ یہی دُنیاداری عین ایمانداری ہے، ورنہ اس ایمانداری کو بے نام ونشان کر دینے اور رُسوائے عالم باور کرانے کے لئے قرآن کی یہ آیتیں نہ اُترتیں بلکہ اُن اقوام کی ان سائنٹیفک ترقیات کو سراہا جاتا اور عذاب کے بجائے اُن پر انعاماتِ الٰہیہ اُترتے۔ قرآن ان کے مناقب بیان کرتا کہ انہوں نے منشائے خداوندی کو پورا کیا اور مسلمانوں کو اُن سے ہٹانے کے بجائے ہدایت کرتا کہ وہ ان اقوام کے نقشِ قدم پر چلیں نہ کہ انبیاء کے، جنہوں نے اُن کی ان ساری ترقیات کو مٹا دینے کے راستے تیار کئے۔ لیکن قرآن نے بتلایا کہ جب مادی مشاغل اُن کی ایمانداری میں حارج ہوتے اور ان فانی لذات میں پڑ کر ان قوموں نے فرائضِ عبودیت ترک کر دیئے اور انبیاء کی تعلیمات کو ٹھکرا دیا تو قہر خداوندی نے انہیں نیست ونابود کر کے دُنیا کو عبرت دلائی کہ اُن کے نقشِ قدم سے دُور ہی دُور رہیں اور اس راہ پر نہ چلیں۔ پھر قرآن کو سب سے زیادہ سمجھنے اور اس پر سب سے زیادہ عمل پیرا ہونے والی ذات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدس ہے۔ آپ نے اس بارہ میں جو عملی نمونہ اور استعمالی اُسوہ پیش فرمایا درحقیقت وہی ان آیتوں کا صحیح مفہوم اور سچا مصداق ہے، سو آپ نے ان کی ان سائنٹیفک اختراعات اور مادی لذات کو مقصودِ زندگی سمجھ کر اُن میں ترقی کرنا تو درکنار اُن سے علی الاطلاق فائدہ اٹھانا اور لذت اندوز ہونا بھی گوارہ نہیں فرمایا بلکہ بقدرِ ضرورت اور وہ بھی باقتضاءِ ضرورت اور اُس پر بھی بکمال قلت اور اقل قلیل کو بھی محض مصلحت دین وروحانیت اختیار فرمایا نہ کہ بلحاظ حظ نفس اور پھر بھی اس سے بے تعلقی کا اعلان فرمادیا کہ :-

مالی وللدنیا انما انا کراکب خیل تحت ظل شجرۃ (الخ) | مجھے دُنیا سے کیا تعلق؟ میں تو ایک گھوڑے سوار کی مانند ہوں (جو سفر میں ہوا اور دم لینے کے لئے کچھ دیر) ایک درخت کے سایہ کے نیچے بیٹھ جائے (اور پھر چلنا شروع کر دے) پس دنیا ایک چلتا پھرتا سایہ ہے اور مسافر آخرت برائے چندے اثناءِ سفر میں اُس کے نیچے دم لے لیتا ہے تاکہ پھر سفر شروع کر دے اور بدستور مقاصدِ عبودیت پورے کرنے میں لگا رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ اس پاک ذوق کے ماتحت یہ رہی ہے کہ آپ نے بیت نبوت میں کبھی ایک حبہ زر وسیم کا جمع رکھنا گوارا نہیں فرمایا۔ اتفاق سے ایک بار ایک آدھ دینار گھر میں رہ گیا جو آپ کو عین مغرب کی نماز کی تکبیر ہو جانے پر یاد آیا تو اسی وقت مصلے سے ہٹ کر گھر میں تشریف لائے، اُسے صدقہ فرمایا اور پھر آ کر نماز شروع فرمائی اور فرمایا کہ بیتِ نبوت کے لئے زیبا نہیں کہ اُس پر رات گزرے اور اُس میں سونا چاندی ہو۔ گھر میں مہینوں دُھواں نہیں اُٹھتا تھا اور آپ فقر وفاقہ کو بصد شوق ورغبت عزیز رکھتے اور فرماتے :-

اللّٰھم اجعل آل محمد قوتاً۔ "اے اللہ! محمدؐ کے اہلِ بیت کا رزق قوت لایموت ہی رہے جس میں افراط نہ ہو۔"

آپ اُمت کے فقر وفاقہ اور ناداری سے خوف نہ کھاتے تھے بلکہ دُنیوی تمول اور دولت داری سے خائف تھے کہ وہ اُمت کے لئے ہلاکت ہے۔ اُمت کو ہدایت فرماتے کہ اقوامِ عالَم پر تمہارا غلبہ زر ومال سے نہ ہو گا بلکہ اخلاقِ محمدی سے

ہوگا۔ جمعِ مال کی ترغیب نہیں دیتے بلکہ اُسے بے عقلی کی نشانی فرماتے ہیں۔ حرص مال پر آمادہ نہیں فرماتے بلکہ قناعت پر اُبھارتے ہیں۔ بلند عمارات کو پسند نہیں فرماتے۔ پست اور بقدرِ ضرورت عمارت کو جائز رکھتے ہیں۔ کسی کی اُونچی عمارت دیکھتے ہیں تو گرانی اور ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے ہیں اور عمارت والے آپؐ کی منشاء کو پاکر اسے منہدم بھی کر دیتے ہیں۔ ازواجِ مطہراتؓ کے لئے تنگ و تاریک حجروں کی معاشرت پسند فرماتے ہیں جن پر کھجور کے پتّوں کی چھت تھی اور مٹی سے اُسے لیپ دیا گیا تھا۔ لباسِ فاخرہ کو ہاتھ نہیں لگاتے اور کسی کی خاطر کوئی ایسا لباس ہدیۃً پہنتے بھی ہیں تو گھبرا کر فوراً اُتار دیتے ہیں اور وہی اپنی پیوند دار کملی طلب فرماتے ہیں۔ لذیذ کھانوں سے بے تعلق رہتے ہیں اور تفنن طعام کو ناپسند فرماتے ہیں۔ عمر بھر کے کھانے کی مقدار میں چند من جَو ہیں جن کا بُھوسہ بھی روٹی میں شامل رہتا ہے۔ بچھونے کے لئے فرشِ خاک اور اُس پر ایک معمولی کمبل زیرِ پُشت رکھتے ہیں۔ دولت کی افزائش کے لئے احتکار (گرانی نرخ کی اُمید پر مالِ تجارت روکے رکھنا) کو روکتے ہیں۔ سُود کو حرام قرار دیتے ہیں۔ قمار کو ممنوع فرماتے ہیں۔ تکاثر کی مذمت فرماتے ہیں۔ سیم وزر کے برتنوں کو ناجائز فرماتے ہیں۔ دیوار ہائے مکان پر منقش پردوں کی نمائش کو مکروہ جانتے ہیں۔ سادۂ لباس (حُلّہ) کو شعار بناتے ہیں اور فیشنوں کی کاٹ تراش سے بے تعلقی اختیار فرماتے ہیں۔ دُنیا کی ٹیپ ٹاپ تو کجا سرے سے دُنیا ہی کو پسند نہیں فرماتے۔ دُنیا و مافیہا کو ملعون فرماتے ہیں۔ دنیا کو مومن کے لئے جیل خانہ فرماتے ہیں۔ دُنیا کو بے گھروں کا گھرانہ فرماتے ہیں۔ دُنیا کو مبغوضِ خداوندی

فرماتے ہیں۔ محبتِ دُنیا کو وسیلۂ جہنم قرار دیتے ہیں۔

غرض ان تمام وسائلِ تمدن اور مادہ کی سائنٹیفک ترقیات، ماکولات، مشروبات، مسکونات، ملبوسات وغیرہ میں جن کی خدمت اور اختراع و اکتشاف کے سلسلہ میں سائنس بے تحاشا دَوڑ لگا رہی ہے۔ آپؐ نے وہ نمونۂ عمل پیش فرمایا کہ اُس میں دُنیا طلبی کا مبالغہ تو کجا سرے ہی سے دُنیا طلبی کا کوئی نشان یا دُنیا سازی کا کوئی نام یا دُنیا بازی کا کوئی ادنیٰ نقش تک نظر نہیں پڑتا بلکہ تا بحد ضرورت اختیار کرنے میں بھی انتہائی تقلیل، انتہائی احتیاط اور انتہائی بے تعلقی کا اُسوہ سامنے آتا ہے جس سے قرآن کریم کی عرض کردہ آیات کا مفہوم اور مصداق متعیّن ہو جاتا ہے کہ منشائے خداوندی یہ دنیاداری نہیں ہے بلکہ ایمان داری ہے جو اس دُنیاداری کی ضد ہے۔ چہ جائیکہ یہ دنیاداری ہی عین ایمانداری ثابت ہو۔

پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی سے (جو اعلیٰ ترین عزیمتوں اور بلند ترین ہمّتوں کا مجموعہ ہے) نیچے اُتر کر بھی اگر اس دُنیاداری اور اُس کے اُن تمدنی مبالغوں کو شریعت کے عام قواعد پر پرکھا جائے جن میں دُنیوی لحاظ سے توسّع اور کافی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ دُنیا کی ہر خدا پرست قوم انہیں اختیار کر سکے تب بھی اس پُوری دنیا کی حیثیت ایک وسیلۂ آخرت سے زیادہ ثابت نہیں ہوتی جس میں ذاتی مقصودیت اور مطلوبیت و محبوبیت کا کوئی شائبہ نہیں نکلتا۔

ارشادِ نبویؐ ہے :-

ان الدنیا خلقت لکم و انکم — "بلاشبہ دُنیا تمہارے لئے بنائی گئی ہے اور تم
خُلقتم للاٰخرۃ ۔ — آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔"

اس شکل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دُنیا تمہاری آخرت کے لئے بنائی گئی ہے یعنی
وسیلۂ آخرت ہے، مقصودِ زندگی نہیں۔ قرآنِ حکیم نے اس کی تصدیق کرتے
ہوئے فرمایا :-

و ما خلقت الجن والانس — "میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف
اِلّا لیعبدون ۔ — عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔"

یعنی دُنیا اور دُنیاداری کی خاطر پیدا نہیں کیا۔ یہی کلمۂ حصر کا مفہوم ہو سکتا
ہے اور جب دُنیا غایتِ تخلیق نہیں تو لامحالہ پوری دُنیا کا وسیلۂ عبادت ہونا
ثابت ہوتا ہے۔

ایک موقعہ پر بذیلِ دُعا لسانِ نبوّت پر اس حقیقت کو ظاہر فرمایا گیا۔
ارشادِ نبویؐ ہے :-

اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی دِیْنِیْ بِالدُّنْیَا — "اے اللہ میرے دین کو دُنیا کے ذریعہ مدد دے
وعَلٰی اٰخرتی بالتقویٰ ۔ — اور میری آخرت کو پرہیزگاری سے۔"

بہرحال ان نصوص سے دُنیا وسیلۂ دین ثابت ہوتی ہے اور عقلی اصول ہے
کہ وسائل صرف تکمیلِ مقاصد کے لئے بقدرِ ضرورت اختیار کئے جاتے ہیں اگر
وہ ضرورت سے بڑھ جائیں یا ضدِ مقصود کے لئے وسیلہ ثابت ہونے لگیں یا
مقصد فوت ہو کر محض وسائل ہی وسائل رہ جائیں گویا تخم تو گل جائے اور
جڑ میں پانی ہی پانی رہ جائے جو تخم کے نشوونما کا محض ایک وسیلہ تھا تو شرعاً

ہی نہیں عقلاً بھی مذموم سمجھا گیا ہے اور اس میں کاشت اور کاشتکار دونوں
کی تباہی ہے۔ گویا یہ تمام سامانِ دُنیا بدن کی پرورش اور بقاء کا ذریعہ ہے۔
اور بدن روح کے لئے مرکب اور سواری ہے جس پر سوار ہو کر وہ راہِ حق
اور آخرت کی منزلیں طے کرتی ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ انسان روح کے
اُس گھوڑے یعنی بدن کے لئے گھاس دانہ فراہم کرے تاکہ وہ سفر کرنے کے
قابل ہو۔ پس سفر سے مقصود منزل ہوتی ہے نہ کہ گھوڑا یا گھاس دانہ۔ اس
صورت میں اگر مقصدِ سفر ہی سامنے نہ ہو تب تو سواری اور گھاس دانہ ہی
کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن جس صورت میں مقصد سامنے ہو تو تحصیلِ
مقصد کی حد تک سواری کا بندوبست کرنا ناگزیر ہوتا ہے مگر وہ وسیلہ ہی
رہتی ہے مقصد نہیں بن جاتی۔

مادّی طاقتوں پر بھروسہ کرنے کی بُنیادی علّت

اسی کے ساتھ یہ نقطہ بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ منزلِ مقصود سامنے
ہو اور سفر کے لئے کوئی دوسرا قریبی وسیلہ ہاتھ لگ جائے تو پھر بعید وسیلہ کی
طرف طبعاً التفات باقی نہیں رہتا بلکہ اُسے قریب قریب ترک کیا دیا جاتا ہے۔
غور کیجئے کہ سفرِ آخرت کی منزلِ مقصود وصول الی اللہ بلکہ قبول عند اللہ
ہے اس کے لئے حسبِ بیانِ بالا دنیا کے یہ تمام اجزاء، مال و جاہ، ہتھیار و اوزار
افراد کے اعداد و شمار اور روٹی و کرسی وغیرہ وسائل ضرور ہیں مگر وسائل بعیدہ
ہیں، کیونکہ منزلِ مقصود باطنی و معنی ہے اور یہ اسباب ظاہری اور مادی ہیں،

ظاہر و باطن اور مادہ و روح میں بہرحال بون بعید ہے۔ اس روحانی مقصد کے لئے وسائلِ قریبہ جو اسے قریب لے آتے ہیں قوتِ یقین، تقویٰ، پرہیزگاری دیانت و امانت، راستبازی، توکل، محبتِ حق، اتباعِ طریق انبیاء اور غیر اللہ سے استغنا وغیرہ ہیں۔ یعنی مادی طاقت سببِ بعید ہے اور اخلاقی طاقت سببِ قریب۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی کے پاس ان باطنی وسائل کی اخلاقی طاقت مضبوط اور منضبط شکل میں موجود ہو تو اسے قدرتاً مادی اور رسمی وسائل کی بودی طاقت کی طرف توجہ ہی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اُسے ان وسائلِ بعیدہ کی زیادہ حاجت ہی پڑیگی جبکہ وہ وسائل قریبہ سے ہمکنار ہے اور منزلِ مقصود اس سے آگی ہے۔

ان رسمی وسائل کی طاقتوں پر بھروسہ اُسی وقت بڑھتا ہے جبکہ اصلی طاقت پاس نہیں ہوتی۔ جیسے کسی شخص کی اصلی صحت قائم نہ رہے تو وہ دواؤں کے بل بوتہ پر اپنی صحت کو برقرار رکھنے کی فکر میں ڈوبا رہتا ہے اور اسی عارضی صحت ہی کو صحت باور کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ حالانکہ دواؤں سے حاصل شدہ صحت اصلی صحت نہیں بلکہ ایک مستقل روگ ہے جسے یہ برخود غلط مریض مرض سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ لیکن جس کے بدن میں اصلی صحت راسخ ہو وہ نہ صرف یہ کہ ان دواؤں کو مڑ کر بھی دیکھتا بلکہ ان سے حاصل شدہ عارضی اور مصنوعی صحت اور اس کے عملِ تحصیل کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

آج یورپ کے ہاتھ میں اخلاقی طاقت نہیں اس لئے اسے ان مادی وسائل میں غرق ہو کر ان مصنوعی اور سطحی اور عارضی طاقتوں پر بھروسہ کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر اس کے پاس اخلاق کی معنوی قوت اور یہ اصلی طاقت ہوتی تو وہ یقیناً اس مصنوعی

اور بناوٹی طاقت کے فریب میں مُبتلا نہ ہوتا۔ دُنیا طبعاً اس کے ہاتھ میں مسخر ہوتی اُسے جبراً و قہراً مسخر کرنے اور ان آہنی، نقرئی، طلائی وسائل کے زور سے اُسے دباتے رہنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

مسلم قوم کو یہ معنوی طاقت مستند اور مضبوط شکل میں دی گئی تھی اس لئے اس نے اپنے ابتدائی اور بعض درمیانی دَوروں میں جبکہ اس کی اصلی صحت قائم تھی جتنے بھی تاریخی کارنامے انجام دیئے وہ ان مادی وسائل سے بالاتر اسباب یعنی اسی اخلاقی طاقت کا ثمرہ تھے جس میں نہ افراد کے اعداد و شمار بُنیادِ کار تھے نہ سیم و زر اصل تھا۔ نہ ان چیزوں کا وجود ضروری تھا۔ یہ وسائل بقدرِ حاجت استغنا کے ساتھ اختیار کر لئے جاتے تھے تاکہ عبدیت و بندگی کی شان ظاہر میں بھی قائم رہے۔ اس حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

انکم لن تسعوھم باموالکم ولکن تسعوھم باخلاقکم۔ "تم دنیا کی اقوام پر اپنے اموال مادی وسائل سے غلبہ نہیں پا سکتے بلکہ اپنے اخلاق سے غالب آسکتے ہو۔"

جوں جوں مسلمانوں میں سے یہ اصلی صحت و قوت، جو اُن کے اسلامی مزاج کے اعتدال سے تعلق رکھتی تھی اور جس کا جامع عنوان فکرِ آخرت تھا گُم ہوتی گئی، وہ بھی عام دُنیا کی طرح اپنی عافیت و صحت مندی، آہنی، نقرئی و طلائی وسائل کی دواؤں میں مضمر سمجھتے گئے جو حقیقتاً اُن کی نہیں بلکہ دوسروں کی طاقت تھی۔ اور بلحاظِ حقیقت وہ طاقت نہ تھی بلکہ بصورتِ طاقت کمزوری تھی اور وہ بھی چند روزہ بہار کی مانند، جو بالآخر حرمان و خسران کا باعث تھی۔ کیونکہ بلا فکرِ آخرت دنیائے محض نہ تو دُنیا ہی ہے۔ کیونکہ دُنیا بہرحال رہنے والی نہیں اور نہ وہ

آخرت ہی ہے۔ کیونکہ آخرت بنانے والے میں فکر ہی نہیں۔ اس لئے نہ دُنیا رہی نہ آخرت۔ خسر الدنیا والاٰخرۃ ذٰلک ھو الخسران المبین۔

مگر جب نقالی کے طور پر مسلمانوں نے بالآخر اس ضعف ہی کو اپنی طاقت سمجھ لیا اور عام دُنیا والوں کی طرح اس کے پیچھے ہو لئے تو اُن کی بنیاد کھوکھلی ہوتی گئی اور باطل کی یہ دبی ہوئی اور مصنوعی طاقتیں جنہیں مسلمانوں کی اخلاقی طاقتوں نے دبا رکھا تھا اُن کے مقابلہ پر اُبھرنے لگیں اور باطل پرستوں نے فرصت پاکر مادّی وسائل کا وہی قیصری و کسروی حربہ، یعنی مادّی طاقت جسے اسلام کی روحانی اور اخلاقی طاقتوں نے پامال کر رکھا تھا، استعمال کیا اور اُسے ترقی دی اور جب اخلاقی قوتوں سے اس کا معارضہ کرنے والا ہی کوئی نہ رہا تو اس کا حلقۂ اثر وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ آج کے غافل اور محرومِ اخلاق مسلمان ان مادّی طاقتوں کے نیچے اس حد تک دب گئے کہ اُن کے ذہن سے اخلاقی قوتوں کے "قوّت" ہونے کا تصوّر بھی جاتا رہا، تا آنکہ وہ اپنی مرعوبانہ ذہنیت اور ذہنی غلامی سے خود ہی اپنی اُس موروثی طاقت پر طعنہ زن ہونے لگے جنہوں نے کل تک ان بناوٹی طاقتوں کو مرعوب کر رکھا تھا۔ آج اُن کے ذہنوں میں فہم کے اُلٹ جانے سے قرآن کا مقصد بھی اسی بناوٹی اور مصنوعی طاقت کا حصول محسوس ہونے لگا۔ خلافتِ الٰہی کے معنی بھی انہی رسمی مصنوعات میں انہماک و انغماض رہ گئے۔ دینداری اور ایمانداری کا مصداق بھی یہی دُنیا داری قرار پا گئی۔ منشائے خداوندی بھی یہی سائنٹیفک آلات و وسائل بن گئے۔ پسندیدۂ الٰہی بھی وہی قومیں قرار پا گئیں جو اِن وسائل کی بندگی اور

پابوسی میں سربسجود ہیں اور مرضیٔ الٰہی بھی وہی ترقی ہو گئی جو آج ان مادّی اقوام کے ہاتھوں ان مادّی وسائل کے ذریعہ سطحِ دُنیا پر نمایاں ہو رہی ہے جس کا حاصل دُنیا کی اقوام پر جبری تغلُّب و استیلاء کے ذریعہ اقوامِ عالم کو دبانا اور اُنہیں بلبلاتا ہُوا دیکھ کر تفریحی ٹھٹھے اور قہقہے لگانا ہے ورنہ اگر ان اقوام کے سامنے کوئی اخلاقی نصب العین مثلاً تہذیبِ نفس، تکمیلِ اخلاق، اصلاحِ عالم، خدائی کمالات سے استکمالِ نفوس، معرفتِ ذات و صفاتِ خداوندی، وصول الی اللہ اور قبول عند اللہ، استعدادِ آخرت، اقامتِ دین، حکمرانیٔ قانونِ الٰہی وغیرہ ہوتا جو کبھی مسلمان کے سامنے تھا تو طبعی طور پر تغلّب و استیلاء کے ان تباہ کن وسائل اور نفوسِ انسانی کو لہو و لعب اور غفلت میں جھونک دینے والے تفریحی وسائل یا تو درمیان ہی میں نہ آتے یا کسی حد تک دفع فتنہ کے لئے آتے تو ان میں مبالغہ و غلو اور مقصودیت کی یہ شان نہ آتی کہ دُنیا کی ساری تجارتیں اور عالم کا ادب ہا اور روپیہ انسانوں کی تعمیر کے بجائے صرف ان ہی مہلکات کی پیداوار کے لئے وقف ہو اور بالذات یہی چیزیں مقاصدِ حیات کا درجہ حاصل کر کے خلافتِ الٰہی اور ایمانداری کا لقب پالیں جس سے حقیقی ایمانداری اور خلافتِ حق پیچھے رہ جائے۔

پس قرآن و سُنّت نے دُنیا کی مذمت کرتے ہوئے اُسے بالاصالتِ مقصود بنا لینے اور اس میں مبالغہ و انہماک کرنے سے روکا ہے۔ البتہ بقدرِ ضرورت اور وہ بھی وسیلۂ آخرت اور خادمِ دین کی حیثیت سے کسب کرتے رہنے کی ہدایت فرمائی جس میں کم و بیش کی تخصیص نہیں کی۔ اگر بضرورتِ دین

بالکل اسی قسم کا تمدن اور تمدنی وسائل درکار ہوں جو آج کی دُنیا پر چھائے ہوئے ہیں تو وہ ضرور حاصل کئے جاویں گے، کیونکہ اسلام ان وسائل سے نہیں روکتا بلکہ انہیں قبلۂ مقصود بنانے سے روکتا ہے۔

پس بالذاتِ مقصود دین ہو گا اور یہ وسائل تحصیلِ مقصد کے لئے ذرائع ہوں گے نہ کہ خود بذاتہٖ مطلوب۔ اور ظاہر ہے کہ اس نکھرے ہوئے تصوّر کے بعد یہ غلو آمیز ترقی اور اس پر فخر و مباہات کی صورت قدرتاً پیدا ہی نہیں ہو گی پس کہاں ملحدانِ مغرب کی دُنیا پرستی اور اُس پر فخر اور کہاں موحدانِ اسلام کی خدا پرستی اور دُنیا گذاری ع

شتّان بین مشرق و مغرب

رہیں وہ آیات و روایات جن میں کائنات کی مصنوعات یا تخلیق کے عجائبات، اور آسمان و زمین وغیرہ کی گوناگوں پیداوار، عناصر و موالید اور ثوابت و سیارات کا تذکرہ فرمایا گیا ہے تو وہ فنِ سائنس سکھلانے اور اُس میں موشگافیاں کر کے صنعت و حرفت کا کاروبار جاری کرنے کے لئے نہیں اتاری گئیں بلکہ صنائع الٰہی میں دعوتِ نظر و فکر دے کر معرفتِ خالق کا سراغ لگانے کے لئے نازل کی گئی ہیں۔ یعنی یہ کائناتی قرآن (آسمان و زمین برق و بخار، آب و ہوا، عناصر موالید اور اُن کے افعال و خواص وغیرہ) جن کو برق صاحب نے عملی قرآن کہا ہے اس علمی قرآن کا وہ مطلوبہ عمل نہیں جس کا بندوں سے مطالبہ کیا گیا ہو کہ وہ قرآن پڑھ کر اس کائناتی صنعت و حرفت کا کاروبار پھیلائیں۔ بلکہ یہ قرآن اتارنے والے کا عمل ہے

جس کی ان آیتوں نے خبر دی ہے اُن میں یہ مطالبہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ان حکایتوں کے محکی عنہ کے مماثل کوئی صنعت بنائیں۔ گویا بندے بھی خدا کی طرح ایک زمین و آسمان تیار کریں یا چاند سورج بنا لائیں۔ بلکہ مطالبہ یہ ہے کہ خدا کی ان محیّر العقول عجائبات میں سلامتیٔ فکر کے ساتھ تدبّر کر کے بنانے والے کی طرف نیازمندانہ اور معترفانہ رجوع کریں اُسے پہچانیں اور یقین کریں کہ یہ مصنوعات وہی بنا سکتا ہے جس کی قدرت لامحدود ہے نہ کہ وہ انسان جس کی قوتیں نہایت محدود اور ضعیف ہیں اور اس طرح بندے اُس کی اس مافوق العادت صنّاعی سے اُس کی خدائی کے قائل اور معترف بنیں اور اُس کے محسنانہ حقوق پہچان کر اُن کی ادائیگی کی فکر کریں۔

پس یہ کائنات آیاتِ قرآنی کے مطلوبہ عمل کی عمل گاہ نہیں بلکہ عارف مزاج انسانوں کے لئے ایک فکر گاہ ہے جس میں غور و تدبر کرنے سے قرآن کے نظریات حل ہوتے ہیں اور قرآنی دعاوی کے لئے ایسے تمثیلی اور بُرہانی دلائل ہاتھ لگتے ہیں جن سے قرآنی مقاصد بآسانی ذہن میں اُتر جاتے ہیں۔

بالفاظِ دیگر قرآن ایک دعویٰ ہے اور کائناتِ عالم اُس کے لئے ایک عادل گواہ ہے جس کی شہادت سے یہ دعویٰ ثابت اور واجب التسلیم ہو جاتا ہے یعنی قرآن کے دقیق معقولات کو اس کائنات کے محسوسات سے تمثیل دے کر بآسانی سمجھا جا سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ شہادت خود مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ مقصود اثباتِ مدّعا ہوتا ہے جس کے لئے شہادت لائی جاتی ہے جب دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے تو گواہوں کو رخصت کر دیتے ہیں اور ثابت شدہ دعویٰ

کو نافذالعمل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

پس شہادت خود دعویٰ کا عمل نہیں ہوتی بلکہ وسیلۂ عمل یا معینِ عمل ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح صحیفۂ کائنات کا مطالعہ اس لئے ضروری ہے کہ اللہ کے دعاوی اور اُس کی بھیجی ہوتی ہدایات کو اُس کے ذریعہ نظری طور پر سمجھ لیا جائے اور اس تمثیلی بُرہان سے معقولاتِ قرآنی کو مثلِ محسوسات کے یقینی اور قطعی سمجھ کر عقیدہ بنایا جائے اور اُس کے مقتضا کو واجب العمل تصور کیا جائے۔ جب یہ دعویٰ ان حسّی دلائل سے ثابت ہو جاتے تو اس کائنات سے قطع نظر کر لی جائے اور ان ثابت شدہ ہدایات کی منشاء کے مطابق عملدرآمد جاری کیا جائے۔ پس قرآنی عمل وہ ہوگا جو ان تکوینی آیات کا مقتضا ہو نہ کہ وہ جو ان آیات کا محکی عنہ اور واقعہ ہو۔ کیونکہ وہ محض دلیل ہے نہ کہ ہدایت اور مدعا۔

پس کائنات کی کھود کُرید کا مطلب اُس کی نظری اور استدلالی تجزیہ ہے جس سے اثباتِ مدعا کے مقدمات پیدا ہوں نہ کہ حسّی تجزیہ کہ جس کی مدد سے عنصری یا اجزا کی کھود کرید کر کے اس جیسی کائنات بنائی جائے اور اُس میں جوڑ توڑ کر کے تمدنی اشیاء کے نئے نئے ڈیزائن اور نمونے تیار کئے جائیں۔ عدالت میں گواہوں کے پیش کئے جانے کا مطلب ساری دُنیا یہ سمجھتی ہے کہ اُن کے اقوال و شہادات کا تجزیہ کر کے اُن کی ہیئت کذائی کو سامنے لا کر دعویٰ کی صحت و عدم صحت کا پتہ لگایا جائے نہ یہ کہ ان گواہوں کی ہڈی پسلی توڑ کر ان جیسا ایک پُتلا اور تیار کیا جائے یا اُس کے اجزائے ترکیبی میں جوڑ توڑ کر کے مختلف سامان بنا لئے جائیں جس سے نہ گواہ باقی رہے نہ

دعویٰ۔ پس آیاتِ کائنات ان آیاتِ قرآنی کے لئے دلائل اور گواہ ہیں نہ کہ اُن کا عملی نمونہ یا عمل کا مادہ۔

دوسرے عنوان سے بطور خلاصۂ کلام یوں سمجھو کہ قرآن حکیم کی آیتیں دو طرح کی ہیں۔ ایک انشائی ہیں جن میں کسی چیز کا امر و نہی کیا گیا ہے اور دوسرے اخباری ہیں جن میں ماضی یا مستقبل کے واقعات کی خبریں دی گئی ہیں خواہ وہ افعالِ عباد سے متعلق ہوں یا افعالِ رب العباد سے۔ ان دونوں ہی قسم کی آیتوں کا مقصد انسانی کو عملی زندگی کی طرف لانا اور کسبِ سعادت کی طرف متوجہ کر کے ان دو آیتوں کے تقاضوں پر چلانا ہے۔ برق صاحب تو ان آیات پہ چلنے کا مطلب خدا کی نقل اُتارنے، اُس جیسا کام کرنے اور اس کی مماثلت کرنے کا لیتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے نزدیک قرآن کا عمل ہی یہ کائنات ہے جو خدا کا فعل ہے اس لئے لامحالہ قرآن پر عمل کرنے کا مطلب خدا کے مماثل کام کرنا ہو جائے گا اور ہم ان آیات پر چلنے کا مطلب اُن کے تقاضوں سے پیدا شدہ احکام پر عمل پیرا ہونا، اُن کے مطالبوں کو پورا کرنا اور اُن کے مقتضیات کو اتباع کرنا سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک قرآن کا مطالبۂ عمل کائنات یا اُس کے مادہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کا مطلوبہ عمل بندہ کے وہ نیاز مندانہ اعمال ہیں جو ان آیات کے تقاضوں کو پُورا کرنے سے رُونما ہوتے ہیں۔ اس لئے پہلا مطلب یعنی مماثلت افعالِ خداوندی ہمارے نزدیک بوجوہ مذکورہ صرف باطل ہی نہیں بلکہ ناممکن العمل بھی ہے جس کی طلب قرآن حکیم جیسی فطری کتاب میں کبھی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ حسبِ زعم برق صاحب اگر مقتضائے آیاتِ

تکوینِ خدا کی جیسی صنعت کا بروئے کار لانا ہوتا تو جیسے ان اخباری آیات کا مقتضا یہ ہوتا کہ اُس کی جیسی ایک کائنات ہم بھی بنائیں جس کی حکایت یہ اخباری آیات کر رہی ہیں۔ ویسے ہی ان شائی آیات کا مقتضا یہ ہونا چاہیئے تھا کہ اُس کے جیسا علم اُس کے جیسا قانون جو اُسی کی جیسی جامع، بلیغ اور اعجازی تعبیر پر مشتمل ہو ہم بھی بنائیں جس کی حکایت پر یہ انشائی آیات مشتمل ہیں۔ گویا بالفاظِ مختصر اخباری آیات کے تحت تو ہم ایک متماثل کائنات بنائیں اور انشائی آیات کے تحت ہم ایک متماثل قرآن بنائیں لیکن جس طرح تشریعی آیات کا مثل لانا ممکن نہیں کہ وہ معجزے ہیں اسی طرح تکوینی آیات کا مثل لانا بھی ممکن نہیں کہ یہ بھی معجزے ہیں۔ وہ علمی معجزہ ہے یہ عملی معجزہ۔ وہ اللہ کا اعجازی کلام ہے اور یہ اُس کا اعجازی کلام۔ اور معجزہ کے معنی جبکہ یہ ہیں کہ وہ بشر کی قدرت سے خارج ہو خواہ علمی ہو خواہ عملی، تو ظاہر ہے کہ حکیمِ مطلق کے کلام میں ایسی چیز کی طلب ہی محالِ عقلی ہے جو مخاطب کی قدرت سے خارج ہو۔ بلکہ اگر غور کرو تو انشائی آیات میں جہاں مماثلت کے یہ معنی نہیں بن سکتے کہ ہم ان ہی جیسی آیتیں بنا لائیں اور خدا کے جیسا کلام کرنے لگیں وہاں مماثلت کے یہ معنی بھی ممکن نہیں کہ جیسی یہ انشائی آیتیں اللہ کے امر و نہی پر مشتمل ہیں جن سے اُس کا فعلِ تشریع اور وصفِ شارعیت کھلتا ہے ہم بھی ویسا ہی امر و نہی کرنے لگیں اور شارع بننے لگیں۔ کیونکہ اِنَّ الحکم الا للّٰہ لیکن اگر برق صاحب کا یہ اصول مان لیا جائے کہ آیت جس چیز کی حکایت کرے اُس کو بنا کر لانا ہی اُس آیت کی تعمیل ہے نہ کہ اُس کی ہدایت یا مقتضا پر عمل کرنا تو جس آیت میں

اللہ کے شارع ہونے کی حکایت ہے وہاں مخاطب کو شارع بن جانا چاہیئے۔ جس آیت میں اللہ کے آسمان و زمین بنانے کی حکایت ہے وہاں مخاطب کو زمین و آسمان بنانا چاہیئے۔ جن آیات میں معذب اقوام کی بدعملیوں کی حکایت ہے وہاں انسان کو بدعمل ہو جانا چاہیئے۔ یعنی جو حکایت ہو وہی عمل بھی ہو سو ظاہر ہے کہ اس کا بدیہیّ البطلان ہونا کون نہیں محسوس کرے گا؟ کیونکہ اس میں اخباری آیتوں میں تو فعلی معجزہ کی طلب لازم آتی ہے اور انشائی آیتوں میں کلامی معجزہ کی طلب پیدا ہوتی ہے یا شارع بننے کا مطالبہ لازم آتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں غیر معقول ہی نہیں ناممکن بھی ہیں۔ مگر یہ سب کچھ لازم آرہا ہے برق صاحب کے اُن اصولِ مذکورہ کی بنا پر جس کو اُنھوں نے آیاتِ اخبار اور معاملاتِ تکوین میں اختیار فرمایا کہ جو آیات کا محکی عنہ قرار پاتے وہی اُس کا موجب بھی ہو اور اُسی کو بعینہٖ عمل میں لانا آیت کی تعمیل کہلائے۔ اس لئے اس اصول کا باطل اور غیر معقول ہونا واضح ہوگیا اور آیاتِ تکوین میں مماثلت افعالِ خداوندی کے معنی لئے جانے بالکل ہی مہمل اور بے معنی ثابت ہوئے۔

ہاں اگر مماثلت کے معنی قدرتی یا غیر اختیاری تشبّہ کے ہیں کہ ہم جب باذنِ الٰہی مادّہ کو توڑ پھوڑ کر اُس کی صنعتی ترکیب و تحلیل سے ضروریاتِ زندگی اور اسبابِ معاش کا استخراج کریں گے تو اس سے قدرتی طور پر افعالِ خداوندی سے فی الجملہ مشابہت لازم آجائے گی یعنی مقصود اسبابِ معاش پیدا کرنا ہوگا نہ کہ تشبّہ بالخالق، تو اس سے ہمیں انکار نہیں۔ مگر یہ اصلًا مماثلت نہیں ہے بلکہ انتفاع اور کسبِ معاش ہے جو جائز ہی نہیں واجب ہے اور جس کا امر کیا گیا ہے۔

مگر وہ امر خود اِن آیاتِ تکوین سے ثابت نہیں ہوتا، بلکہ اُس کے لئے جداگانہ مستقل احکام اور حدود ہیں جنہیں شریعت نے اپنے اپنے موقعہ پر واضح فرمادیا ہے۔

ان آیاتِ کائنات کا حاصل اور تقاضا صرف فکر و تدبر، مصنوع سے صنائع پر استدلال اور خالق کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ پس ہمیں اس سے انکار نہیں کہ کائناتی مادّوں سے انسان صنعت و حرفت کے ذریعہ ضروریاتِ زندگی مُہیا کرے کیونکہ یہ خود مامور بہ ہے۔ انکار اس سے ہے کہ ان آیاتِ تکوین کا منشاء صنعت و حرفت کی ترقی یا اُن کا تجارتی کاروبار پھیلانا ہے، جس کا دعویٰ برق صاحب کر رہے ہیں۔ ان آیات کا ماحصل تکوینی دلائل سے معرفتِ خالق ہے۔ چنانچہ ان آیات میں جگہ جگہ مصنوعاتِ الٰہیہ اور تخلیقِ خداوندی کے نمونے زمین، آسمان، بجلی، ہوا، بادل، آگ، حیوان، انسان، جمادات، نباتات اور ان کے طبعی افعال و خواص وغیرہ پیش کر کے ہر جگہ آخر میں صرف یہ کہنے پر قناعت کی گئی ہے کہ ان میں اللہ کی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ مگر کن کے لئے ؟ لقوم یعقلون ، لقوم یتفکرون ، لقوم یسمعون ، لقوم یتذکرون ، لاولی الالباب ، لاولی النُّھٰی ۔ یعنی ان میں نشانیاں ہیں عقلاء کے لئے، مفکّروں کے لئے، سمع و طاعت والوں کے لئے، بیدار مغزوں کے لئے، دانش مندوں کے لئے اور ہوش مندوں کے لئے ۔ کیونکہ ظاہر سے باطن کا پتہ لگالینا، صورت سے ماہیّت کا سراغ نکال لانا اور ہیئت سے حقیقت تک پہنچ جانا ہی عقل، تدبر، دانش، ہوشمندی، فکر رسا اور بیدار مغزی

کا کرشمہ ہو سکتا ہے۔ گویا مادّہ کا معنوی تجزیہ کر کے اُس سے علم پیدا کرنا۔ اور وہ بھی علم حقیقت اور پھر اُس سے حقیقۃ الحقائق تک جا پہنچنا بلاشبہ اونچی عقل اور اعلیٰ دانائی ہی کا کام ہے۔ یہی قدرت کی وہ بڑی نشانی ہے جس کو اہلِ عقل ان تکوینیات میں سے نکال لاتے ہیں۔ لیکن مادہ کو توڑ پھوڑ چھری کانٹے بنا لینا، ریل، موٹر چلا لینا، برق و بخار سے لوہے کی کلیں ہلا دینا اور مختلف قسم کی صناعیاں بروئے کار لا کر بازاروں اور دکانوں کو تجارتی مال سے پاٹ دینا اور اُس سے سرمایہ دار بن کر اینٹھ مروڑ سے رہنا آخر کون سی ایسی بڑی نشانی تھی جو قرآن کے اُترے بغیر کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی؟ قرآن جب تک نہیں اُترا تھا جب بھی تو ہر قسم اپنے مناسبِ حال و مزاج اور ضروریات وقت کے لحاظ سے اِن ساری صنعتوں میں ترقی کر رہی تھی۔ عاد و ثمود جیسی قوموں کی حیرت ناک مُدنیتہ کے کارنامے اُن کے بعد کلدانیوں، قوم ابراہیمؑ کی طلسماتی ترقیات اُن کے بعد رومیوں اور ایرانیوں کے اعلیٰ ترین تمدّنی عجائبات، نیز اور دوسری اقوام کی محیر العقول مادّی صناعیاں قرآن ہی کے بیان کے مطابق اُس کے نازل ہونے سے کہیں پہلے سے موجود تھیں۔ اُن کا وجود قطعاً قرآن کے نزول پر موقوف نہ تھا - بلکہ سرے سے نبوّت پر بھی معلق نہ تھا، بلکہ ایسی ترقیات زیادہ تر اُن اقوام نے کی ہیں جو نبوّتوں سے بیزار اور آسمانی کتابوں کا مذاق اڑانے والی تھیں۔ پس یہ تمدّنی صنعت گری کون سی اہم چیز تھی کہ اگر قرآن نہ اترتا تو وہ رونما نہ ہوتی ؟

کیا برق صاحب اس کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ یورپ کے ترقی یافتہ

باشندوں نے یہ مادی ترقی قرآن پڑھ پڑھ کر کی ہے اور کیا انگلستان امریکہ، جرمنی اور جاپان وغیرہ کے مشینی کارخانے، سورۂ بقرہ اور آلِ عمران سے مستنبط کئے گئے ہیں کہ آج کے مسلمان بھی قرآن پڑھ پڑھ کر ٹیکنیکل کارخانوں کا سنگِ بنیاد رکھیں اور اُن میں بڑھیں چڑھیں؟ آج کے حکمرانِ یورپ قرآن ہی کو نہیں سرے سے نبوت ہی کو تسلیم نہیں کرتے اور اگر کوئی اپنے خیال میں کسی حد تک کسی نبی یا کتاب کو مانتا بھی ہے تو صرف ادب اور انشاء یا نظر و فکر کی حد تک مگر معاملات میں اُسے کلیتہً ٹھکرائے ہوئے ہے لیکن اُن کی کون سی صنعت و حرفت یا مادی ترقی اس بے عملی سے رُکی ہوئی ہے کہ اُن کی ترقیات کو قرآنی عمل پکارا جائے۔

پس قرآن کا بزعم برق صاحب بڑے شد و مد سے ایسے امور پر توجہ دلانا جو سرے سے اُس کے وجود و نزول ہی پر موقوف نہ تھے اور ایسے بتذل علوم لاکر پیش کرنا جو پہلے سے عوام کو معلوم تھے اور ایسی ترقی کو اپنی ترقی کہنا جو اُس کو ٹھکرا دینے والی قومیں اُس کے برعکس عمل پیرا ہو کر بھی کر رہی ہیں اور کرتی آرہی ہیں۔ کونسا ایسا عظیم کارنامہ تھا کہ قرآن سر اُونچا کر کے اُسے عقلاء اور مفکروں کے سامنے بطورِ آیاتِ قدرت پیش کرتا؟ اس لئے ان آیاتِ قرآنی کی پیروی کے معنی افعالِ خداوندی کے ساتھ کسی ارادی مماثلت یا مشابہت کے ثابت ہو ہی نہیں سکتے کہ انہیں مدلولاتِ قرآنی کہا جائے، بلکہ یہ تفسیر بالرائے اور ایک ذہنی اختراع ہے جسے قرآن کے سر زبردستی تھوپا جا رہا ہے ؎

وکل یدعی حبًا للیلیٰ　　　وسیلیٰ لا تقر لھم بذاکٔ

پس جبکہ قرآن کی اخباری آیات کی پیروی اور اُس میں چھپی ہوئی نشانیوں سے عملی زندگی بنانے کا مطلب نہ مماثلت نکلتا ہے نہ تشبہ بالخالق جو برق صاحب کا منصوبہ تھا، تو پھر وہ کونسی عظیم المرتبت چیز ہے جو اِن اخباری آیتوں کے ذریعہ انسانوں تک پہنچانی مقصود ہے۔

اگر دل کی گہرائیوں سے غور کیا جائے تو وہ مقصد بجز کسی علمی اور عرفانی مقصد کے کوئی صنعتی یا تجارتی مقصد نہیں ہو سکتا اور وہ علم و عرفان بھی کائناتی مخلوق یا مواد و عناصر سے متعلق نہیں۔ کیونکہ اُس کے لئے صرف حیوانی حس کافی ہے کسی علم اعلیٰ یا عقل اعلیٰ کی ضرورت ہی نہیں، بلکہ وہ علم و عرفان خالقِ کائنات ہی کی ذات و صفات اور حقائقِ الٰہیہ سے متعلق ہو سکتا ہے کیونکہ نہ اُس سے اعلیٰ کوئی علم ہے نہ اُس سے اونچی کوئی معرفت۔ اور بلاشبہ قرآن ہی کے لئے زیبا تھا کہ وہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اُترے اور پوری شد و مد سے قدرت کی ہزاروں حسی اور معنوی آفاقی اور انفسی نشانیاں دکھلا کر انسانوں کو ایسے اچھوتے انداز میں یہ اعلیٰ ترین مقصد سمجھائے جس کی نظیر سابق میں نہ ملے تاکہ اُس کے علمی اعجاز اور عرفانی انداز کا آج کی متمدن اور ترقی یافتہ دُنیا بھی لوہا مانے بغیر نہ رہ سکے اور خدا کی حجت اِس دَور کے انسانوں پر تمام ہو جائے۔

پس ان تکوینی آیات سے درحقیقت نظر و فکر اور استدلال کی طرف توجہ کرنا مقصود ہے تاکہ آدمی مخلوق سے خالق کی طرف اور مصنوعات سے صانعِ عالم کی طرف متوجہ ہو اور ساری کائنات کو آئینۂ جمالِ حق بنا کر اُس کے ذریعہ سے حق اور کمالاتِ حق کا مشاہدہ کرے، اُس کی عظمت اپنے دل میں بٹھلائے اور اس معرفت کو جوہرِ نفس اور صفتِ قلب و روح کر کے حبِ آخرت میں

پہنچے تو حقائق اُس کے سامنے عیاں ہوں اور حقیقۃ الحقائق کا عینی مشاہدہ
اُسے میسّر آجائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان آیاتِ قرآنی کے علوم کا مقتضاء یہ مادّی تصرّفات نہیں،
جو غلطی سے سمجھ لیا گیا ہے اور اسی لئے اس کائنات کو عملی قرآن کہہ دیا گیا۔ بلکہ
ان خدائی تصرفات میں غور و فکر کرکے استدلال کے ساتھ معرفتِ خالق کا عقیدہ
دل میں جمانا اور معرفتِ نفس کی تکمیل کرکے اُس کی قوتِ عملیہ کو مضبوط بنانا ہے۔
تاکہ وہ اللہ کے اوامر و نواہی والی آیتوں کی تعمیل کے لئے مستعد اور ہمہ تن شوق
بن کر عملی میدان میں آجائے اور اس طرح قوتِ عملیہ کی تکمیل ہو جائے۔

پس یہ آیتیں درحقیقت قلب سے تو اُس عرفانی عمل کا تقاضا کرتی ہیں جس
کا نام عقیدہ ہے اور قالب سے اُس حسّی عمل کا تقاضا کرتی ہیں جس کا نام عملِ
صالح ہے، جو قربِ الٰہی کے درجات پر انسان کو چڑھاتا ہے۔ یعنی کوئی آیت تو
مصنوعاتِ الٰہیّہ کو پیش کرکے وجودِ صانع کے عقیدہ کو دلوں میں بدلائل راسخ
کرنا چاہتی ہے۔ کوئی آیت قدرت کی تکوینی نشانیاں دکھلا کر اُس کی توحید کا
عقیدہ دلوں میں جمانا چاہتی ہے۔ پھر کوئی آیت اُس کا کمالِ صناعی پیش کرکے
اس کی تنزیہ و تقدیس کا عقیدہ سامنے لاتی ہے اور کوئی آیت اتقانِ صنعت
سامنے لاکر اُس کی حمد و ثنا کا جذبہ اُبھارنا چاہتی ہے۔

پس ان آیات کا مقتضاء اور تقاضا کردہ عمل، افعالِ خداوندی کی مماثلت
یا صنعت و حرفت اور تمدّنی ایجادات کی ترقی نہیں بلکہ دینی فکر و تدبر کی ترقی
ہے۔ گویا تدبّر فی الآیات سے معرفتِ حقائق اور معرفتِ الٰہی تک پہنچنا جو

افعالِ قلوب اور مساعیٔ روح کی ترقی ہے اور پھر ان عرفانی عقیدوں کے تقاضا
سے افعالِ عبودیت کی ادائیگی اور عام بدنی عبادات کا بروئے کار لایا جانا ہے۔
جو درحقیقت ان عقائد کے آثار اور ثمرات کی ترقی ہے۔

ہاں مگر ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیئے کہ معرفتِ عقائد میں استقامت
اور قوتِ عملیہ کی راستبازی جس میں کجی اور کج فہمی کا شائبہ نہ ہو، بغیر ذہن
کی سلامتی اور ذہنیت کی استقامت کے ناممکن ہے۔ پھر اس صحیح معرفت
اور علمی قوت کی حقیقی راستی کے بعد بھی عادۃً عمل کا نقشہ اُس وقت تک صحیح
اور مطلوبہ انداز پر نہیں آسکتا جب تک کسی عارف کا کوئی عملی نمونہ سامنے نہ
ہو تاکہ اُسے دیکھ دیکھ کر اور اُس پر تطبیق دے دے کر عمل و عبادت کے وہی
نقشے بنتے رہیں جو مطلوب ہیں۔ بالخصوص جبکہ یہ عمل خدا تک پہنچنے اور اُس
کے قرب حاصل کرنے کا ہو تو وہ اُس وقت تک کبھی بھی مطلوبہ نہج پر استوار
نہیں ہو سکتا جب تک کہ عمل کا کوئی خدائی نمونہ سامنے نہ ہو جس کی زبان، طرزِ
ادا، لب و لہجہ اور اشارات وغیرہ سے ہم خدا کے قانون اور اُس کی علمی مرادوں
کو سمجھ سکیں اور جس کے عملی نمونوں کی محسوس ہیئتوں کو ذہن میں جما کر ہم اُسی انداز
سے عمل پیرا ہو سکیں اور اس طرح ہمارا علم تو صحیح ہو کہ علمِ نافع بن جائے اور عمل
مقبول ہو کر عملِ صالح ہو جائے جو منزلِ مقصود تک پہنچا سکے۔ اس لئے
حق تعالےٰ نے قرآن اُتارا کہ اُس کے تمام علمی و عملی گوشوں کو نمایاں کرنے اور
فہم و عمل کی صحیح رہنمائی کے لئے ذاتِ بابرکاتِ محمدیؐ کو حسی اور عملی نمونہ بنا کر
دُنیا کے سامنے پیش کیا تاکہ آپؐ کے خالص اور قطعی علم بالقرآن سے ہم علم سیکھیں

اور آپؐ کے مقبول اور مصدقۂ الٰہی عمل بالقرآن سے ہم عبادت، عادت اور معاشرت و سیاست وغیرہ کے عمل کی مطلوبہ صورتیں قائم کرسکیں اور آپؐ کے تخلق باخلاق اللہ سے ہم اپنے قوائے عمل اور اخلاق صحیح کرلیں۔ اس لئے عملی قرآن حقیقتاً ذاتِ محمدیؐ ثابت ہوتی ہے جس نے قرآنی علوم کے مطابق عملی نمونے قائم کرکے دکھلائے نہ کہ یہ کائنات حسی۔ کیونکہ اگر یہ عمل ہے تو خدا کا ہے نہ کہ بندوں کا مطلوبہ عمل۔ اور خدا کا عمل یقیناً عبادت نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ بندوں سے عمل بالقرآن کی صورت میں عبادت مطلوب ہے جو بنصِ قرآن تخلیق انسانی یعنی عالمِ خلق کی بھی حقیقی غایت ہے :-

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون (پارہ قال فما خطبکم) (سورۃ الذاریات)	"اور میں نے جن وانس کو (دراصل) اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کیا کریں"

اور عالمِ امر و نہی کی بھی واحد غرض و غایت یہی ہے :-

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ - (پارہ عم سورۃ بیّنہ)	"حالانکہ اُن لوگوں کو یہی حکم ہُوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت کو اسی کے لئے خاص رکھیں، یکسو ہو کر نماز کی پابندی رکھیں اور زکوٰۃ دیا کریں، یہی طریقہ ہے ان درست مضامین کا"

اور خود اس عالمِ خلق یعنی کائنات اور اُس کے عناصر و موالید نیز اُس کے افعال و خواص کا ذکر، سو وہ محض مثال اور دلیل کے طور پر سامنے لایا گیا ہے نہ کہ

نمونۂ عمل بنا کر۔ اگر کائنات کا یہ صنعتی عمل ہی قرآن کا مقتضاد ہو تو مروضۂ سابق کے مطابق جبکہ اخباری آیات کے تحت ہر مخاطبِ قرآن پر ایک کائنات بنانا اور نشانیٔ آیات کے تحت ایک قرآن بنانا، بمماثلتِ خداوندی ضروری ہوگا تو حاصل یہ نکلے گا کہ انسان اس عالَم میں بندگی کرنے نہیں آیا بلکہ خدائی کرنے کے لئے آیا ہے۔ حالانکہ اس بدیہی البطلان نظریہ کا رَدّ قرآن کی آیاتِ بالا اور عقلِ سلیم نیز بحیثیت مجموعی پورا دین صاف طور پر کر رہا ہے جس کی اسلام میں کوئی کھپت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے اس کائنات کے قرآنی عمل ہونے کا دعویٰ ثابت نہ ہوگا بلکہ واضح ہوگا کہ قرآنی عمل جبکہ عبادت اور بندگی ہے تو اس اُمت کا عبدِ کامل ہی اس قرآنی عمل کا نمونہ ہوسکتا ہے (اور وہ عبدِ کامل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہوسکتا) نہ کہ جبال و بحار اور دخان و بخار۔ پس اگر برق صاحب کی طرح تعددِ قرآن کا دعویٰ ہی کچھ قرآن کی منقبتِ عظیمہ ہے تو وہ یوں ہونا چاہیئے تھا کہ اس عالمِ موجودات میں ایک یا دو ہی قرآن جلوہ گر نہیں ہوئے، جیسا کہ برق صاحب کا دعویٰ ہے بلکہ تین قرآن لائے گئے ہیں۔ ایک یہ کتابی قرآن جو مجموعۂ احکام ہے۔ ایک یہ کائناتی قرآن جو مجموعۂ شواہد و دلائل ہے اور ایک یہ انفسی قرآن یعنی ذاتِ نبویؐ جو مجموعۂ اخلاق و اعمال ہے۔

پس کتاب اللہ یعنی اوراقِ مرقوم کو تعلیمی قرآن کہنا چاہیئے اور اس کائنات کو تمثیلی قرآن کہنا چاہیئے اور رسول اللہ یعنی ذاتِ محمدیؐ کو تعمیلی قرآن کہنا چاہیئے۔

پس جو کتاب اللہ سے آنکھ بند کرلے گا وہ علم و ہدایت سے محروم رہے گا۔ جو کائنات میں تفکر سے آنکھ بند کرلے گا وہ شہودی دلائل سے محروم رہ جائے گا اور جو اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرفِ نظر کریگا وہ علم بالقرآن سے محروم رہ جائے گا۔

بہرحال سماوات و ارض کے عجائبات کی طرف متوجہ کرنے اور اُن میں غور و فکر کا امر کرنے کا مقصد قرآنی ہدایات کی روشنی میں معرفتِ خالق، معرفتِ توحیدِ ذات و صفات اور معرفتِ توحیدِ افعال۔ سے نفسِ انسانی کی تکمیل اور اُسے فضائلِ علم و اخلاق سے آراستہ اور مہذب بنانا ہے۔ ریل و تار، فون و لاسلکی، موٹر اور جہاز وغیرہ کے کارخانے کھلوانا نہیں یعنی موحد اور عابد بنانا ہے۔ انجنیئر، لوہار اور بڑھئی بنانا نہیں۔ کیونکہ یہ سب کچھ بننا نہ قرآن پر موقوف ہے نہ ختمِ نبوت کی لائی ہوئی معرفت و بصیرت پر۔ البتہ بطور وسیلۂ عبادت ان مادی اشیاء اور تمدنی صنائع سے کلیۃً الگ کر دیا جانا بھی مقصود نہیں بلکہ بضرورتِ عبادت اور بضرورتِ نفاذِ خلافت ان وسائل کی تحصیل بھی ضروری قرار دی گئی ہے تاکہ معاش کی طرف سے مطمئن ہو کر ایک انسان معاد کی فکر کر سکے اور قانونِ الٰہی کو قوت سے دنیا میں پھیلانے اور رواج دینے میں اُس کے لئے کوئی مانع یا حیلہ باقی نہ رہے۔ بالفاظِ دیگر وہ اسبابِ معاش سے تو اپنے نفس کا مقابلہ کر سکے جو راہِ دین میں سب سے بڑا دشمن اور مانع ہے اور وسائلِ قوت و شوکت سے فتنہ پردازوں کا مقابلہ کر سکے جو راہِ شوکتِ دین میں سب سے بڑے حارج اور مانع ہیں اور اس طرح اعدائے نفسی اور اعدائے آفاقی

کی دستبرد سے دین اور شوکتِ دین محفوظ رہے۔

پس یہ مادی وسائل اور تمدنی ایجادات برق و بخار، ریل و تار، گن اور بم موٹر اور جہاز، یا زمانہ کے حسبِ حال دیگر اسبابِ نقل و حمل اور اسبابِ عمل و خبر جس کسی دور میں بھی چل پڑیں گے اور اُن پر حیاتِ دنیا موقوف ٹھہر جائے گی تو اسلام بھی انہیں لامحالہ اختیار کرنے سے نہیں رکے گا۔ لیکن نہ وہ اُن کی ایجاد و تخلیق کو مقصدِ زندگی بنائے گا، نہ اُن کی تخلیق و ایجاد میں بالاصالت وقت صرف کرنا ضروری سمجھے گا۔ البتہ اگر چل پڑیں گے تو بطورِ وسیلہ انہیں قبول کرلے گا لیکن جب بھی اُس کی اخلاق قوتیں بروئے کار آجائیں گی تو وہ ان مصنوعی قوتوں سے اس کے لئے جگہ خالی کرائے گا۔

پس اسلامی نقطۂ نظر سے نہ تو نظری طور پر ان وسائل کو مقاصد باور کرنا ہی جائز رکھا گیا ہے اور نہ عملی طور پر ان میں برنگِ مقاصد غرق اور مستہلک ہو جانا ہی روا رکھا گیا ہے۔

اس نوعیت کے واضح ہو جانے کے بعد یہ جرأت نہ ہونی چاہیئے کہ مقاصدِ عبودیت کو چھوڑ کر صرف ان فانی وسائل میں کھو جانے اور انہیں ہی مقصدِ زندگی ٹھہرا لینے کو خلافتِ الٰہی کہا جائے۔ کوئی بھی سنجیدہ عقل اسے تسلیم نہیں کر سکتی کہ جس خلافتِ الٰہی کے برپا کرنے کے لئے ہزارہا انبیاء مبعوث ہوئے، لاکھوں حواری اور صحابۂ انبیاء پیدا کئے گئے اور کروڑوں نائبانِ انبیاء اور صلحاء ظاہر ہوتے اُس خلافت کے معنی لوہے، پیتل، لکڑی اور پتھر وغیرہ کے مختلف معاشی سامان ڈھال لینے اور اُن سامانوں سے اسبابِ عیش و نشاط یا اسباب

تباہی وہلاکت افراط کے ساتھ مہیا کر کے دُنیا میں فساد مچانے کے ہیں۔ اگر یہی خلافت الٰہی تھی تو معاذ اللہ فرعونِ مصر، کسرائے فارس، قیصرِ روم، خاقانِ چین، راجائے ہند، نیز دوسرے اور بڑے بڑے عیش پسند یا جنگ جو سرمایہ دار بلکہ تمام دُشمنانِ انبیاء جیسے قارون اور ہامان، نمرود اور شدّاد، بوجہل اور بولہب وغیرہ سب سے بڑے خلفائے الٰہی ثابت ہوتے ہیں۔ یا پھر بڑے بڑے صنّاع لوہار، بڑھئی صراف اور سُنار وغیرہ خلفائے الٰہی ثابت ہوں گے اور جب کہ ان فنون اور فن کاروں کے وجود کے لئے قرآن اور نبوت ہی کی ضرورت نہ تھی تو دوسرے لفظوں میں اس خلافت کے لئے بھی نہ نبوت کی ضرورت رہتی ہے نہ قرآن کی، بلکہ اس خلافت کے حق میں نبوت حارج نکلتی ہے۔ اس لئے کوئی نبی بھی اس "برقی اصول" پر خلیفۂ الٰہی باقی نہیں رہ سکتا۔ بلکہ کوئی بھی ایسا شخص جو ان مادیات کے عشق سے کٹ کر یادِ خداوندی میں راسخ القدم ہو، دُنیا پر آخرت کو ترجیح دیتا ہو یا آخرت کے راستہ سے دُنیا پر قابو پانے کا جذبہ و عمل رکھتا ہو، خلافت کی فہرست میں شامل نہیں رہ سکتا۔ حالانکہ اس نظریہ کے محالِ شرعی ہونے میں کسی بلید سے بلید انسان کو بھی تأمل نہیں ہو سکتا۔

مگر یہ شرعی استحالہ محض اس لئے لازم آیا کہ خلافت کے معنی اُلٹ دیئے گئے اور اُس کے عنوان کو باقی رکھ کر اُس کے حقیقی مفہوم میں معنوی تحریف کر دی گئی جس سے خلافت کا لفظ تو باقی رہ گیا اور حقیقت گُم ہو گئی۔ اس تلبیس کی انتاجی شکل برق صاحب کے نظریہ پر اب یوں ہو جاتی ہے کہ خلافت کی حقیقت ایمانداری ہے اور ایمانداری کی حقیقت یہ دُنیا داری ہے اور دُنیا داری کی حقیقت یہ لوہاری اور

نجاری ہے اور لوہاری ونجاری کی حقیقت دوکانداری ہے اور اس دوکانداری کی حقیقت عیاشی اور ظلم کی گرم بازاری ہے۔ لہٰذا خلافت کے معنی عیاشی اور ظلم وستم کے نکل آتے اور یہ خلافت جبکہ خدا کی ہے اور یہ انسان اُسی کا خلیفہ اور نائب بن کر آیا ہے تو معاذ اللہ یہ عیّاشی اور ستم رانی آخر میں خدا کا وصفِ خاص ثابت ہو جاتی ہے۔ فَلَا حول ولا قُوۃ اِلّا باللہ۔ کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون اِلّا کذبا۔

پس کہاں خلافت کے معنی تکمیلِ انسانیت کے تھے اور کہاں اب تخریبِ انسانیت کے نکلے۔ یہ سب اُسی بدذوقی اور زیغ کا نتیجہ ہے کہ جو تزکیہ سے الگ رہ کر محض الفاظِ قرآن سے اُس کے معنی ناہموار نفس سے اختراع کر لئے گئے۔ اُن ہی کو مرادِ ربّانی سمجھ لیا گیا ہے اور دین کو الہامی رکھنے کے بجائے اختراعی قرار دے لیا گیا تاکہ اس کی تعبیرات کو باقی رکھ کر ازراہِ تلبیس اُس کے معانی میں من مانے تصرّفات کے راستے کُھلے رہیں اور اس طرح مسلمانوں کو الفاظِ قرآنی سُنا کر بآسانی جال میں پھانسا جا سکے۔

بہر حال جس خلافتِ الٰہی کے لفظ کو ہاتھ میں لے کر یہ تجارتی، صنعتی اور تمدنی ترقی اس کے مفہوم میں شامل کی گئی بلکہ تنہا اُسی کو اُس کا صحیح مفہوم قرار دیدیا گیا اُس کی حقیقت اچھی طرح واضح کر دی گئی تاہم اس کی ضرورت پھر بھی باقی رہ جاتی ہے کہ بحث وتنقید سے الگ ہو کر تحقیق کی نگاہ سے بھی اس مسئلہ کو دیکھا جائے اور یہ بتلایا جائے کہ اگر خلافت اور ایمانداری کے وہ معنی نہیں اور یقیناً نہیں کہ جن کو برق صاحب نے اختیار کیا ہے تو اُس کے اصلی معنی کیا ہیں؟ اور اگر یہ تمدنی ایجادات

اور مادہ کو توڑ پھوڑ کر مختلف اشیاء بنانا یا عناصرِ کائنات کو مسخر کرنا ہواؤں میں اُڑنا اور ایجاد و اختراع سے مادّی عالَم کو قابو میں لے آنا خلافتِ الٰہی نہیں تو کیا پھر خلافت کے معنی بقول برق صاحب اُسی کو رہی مُلّائیت کے نہیں رہ جاتے جس کے نیچے بقول موصوف منشائے قدرت سے ناواقفی، انفسی اور آفاقی وسائل سے بے خبری اور انجام کار بے بسی اور بے حسّی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے؟ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ خلافتِ الٰہی کی نوعیت پر ایسے انداز سے روشنی ڈالی جائے کہ تسخیرِ کائنات کی وہ نوعیت بھی روشن ہو جائے جو قرآن نے انسان سے طلب کی ہے اور خلافت کا حقیقی مفہوم، نیز عبادت و بندگی یا دیانت کے فرائض کا تعلق بھی اس تسخیرِ عالَم سے واضح ہو جائے جو اساس خلافت کی حیثیت رکھتا ہے اور ساتھ ہی جن تین قرآنوں کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اُن کے عرض کردہ موضوع اور مقصد کی نوعیت بھی تحقیقی رنگ میں کھل جائے۔

قرآن کا مقصدِ وحید تکمیلِ خلافت ہے

سو حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کا مقصدِ وحید انسان کو اُس کی حدِ کمال پر پہنچا کر اس کی انسانیت کی تکمیل کرنا ہے اور جبکہ کمال کا حقیقی سرچشمہ ذاتِ خداوندی کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا جس کے اوصاف و افعال سے اُسی کے فرمان کے مطابق مشابہت پیدا کر کے اُن کمالات کو بقدرِ استعداد و قابلیت جوہرِ نفس بنا لینا ہی انسانیت کی تکمیل ہے اور اس تشبّہ یا استکمال ہی سے خدا کی نیابت و خلافت کا استحقاق خصوصی طور پر انسان کے لئے ثابت ہوتا

ہے تو تکمیلِ انسانیت ہی کا دوسرا نام تکمیلِ خلافت ٹھہرا اور قرآنِ حکیم کا حقیقی مقصد انسان کو خلیفۂ ربانی دکھانا قرار پایا۔

معیارِ خلافت و استخلاف

ظاہر ہے کہ کوئی بھی کسی کا خلیفہ یا نائب اور قائم مقام اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ منیب اور اصل کے اوصاف کو اپنے اندر سمو نہ لے اور اُن سے متاثر ہو کر اصل کا نمونہ نہ بن جائے۔ ایک عالم کا خلیفہ ایک عالم ہی ہو سکتا ہے نہ کہ جاہل۔ ایک عارفِ باللہ اور روشن ضمیر درویش کا خلیفہ عارف ہی ہو سکتا ہے نہ کہ تنگ سینہ اور کور باطن۔ ایک بااقتدار بادشاہ کا قائم مقام بااقتدار ہی بن سکتا ہے نہ کہ گداگر بے نوا اور عاجز و درماندہ۔ ایک پہلوان کا خلیفہ پہلوان ہی ہو گا نہ کہ پہلوانی کے داؤ پیچ سے نابلد، ایک شاعر کا قائم مقام شاعر ہی ہو سکتا ہے نہ کہ فنِ شاعری سے ناواقف۔

اس لئے خدائے برتر و توانا کا خلیفہ وہی ہو سکتا ہے جو خدائی اوصاف و کمالات کا پرتو اپنے اندر لئے ہوئے ہو، اُن سے متاثر ہو۔ اُن کا سچا نمونہ بن کر پردۂ دنیا پر نمودار ہو اور پوری طرح اُس کا اطاعت شعار ہو کر اُس کی مرضیات پر عمل پیرا ہو۔ نہ کہ وہ جو اُس کے اوصاف و کمالات سے قطعاً ناآشنا یا اُن کی نسبت سے نااہل اور یا اُن اوصاف و شئون کی مخالف سمت میں جا رہا ہو اور اُسے اطاعت و انقیاد سے کوئی واسطہ نہ ہو بلکہ ہر آن بغاوت پر تلا ہوا ہو۔

کمالاتِ خداوندی کی تین نوعیں

ہاں، اگر اللہ جلّ ذکرہ کے وہ لامحدود کمالات جن کے اقتباس سے آدم، خلیفۃ الٰہی قرار پاتا ہے اصولی نقطۂ نظر سے تین نوعوں میں منحصر نظر آتے ہیں۔ کمالاتِ علم وادراک، کمالاتِ وصف واخلاق اور کمالاتِ صنعت وافعال۔ چنانچہ کتاب وسنت میں جس قدر بھی اسماء وصفات اسم یا افعال کی صورت سے ذکر فرمائے گئے ہیں وہ سب ان ہی تین انواعِ کمالات کی نشان دہی کرتے ہیں یا وہ علمی اسماء ہیں جن سے اللہ کے علمی کمالات پر روشنی پڑتی ہے جیسے علیم وخبیر، سمیع وبصیر، مدرکٌ وواجد وغیرہ۔ یا وہ اخلاقی اسماء ہیں جن سے اُس کے جوہری اخلاق اور پاکیزہ وسطیف قوائے باطن پر روشنی پڑتی ہے جیسے صبور وشکور، رؤف وغفور، رحیم وکریم، عفو وحلیم اور قوی ومتین وغیرہ۔ یا افعالی اور صنائعی اسماء ہیں جن سے اُس کے صنعتی کمالات پر روشنی پڑتی ہے جیسے خالق وباری، بدیع ومصور، مبدئ ومعید، محیی وممیت، نافع وضار اور رازق ومعطی وغیرہ۔ بقیہ اسماء سب کے سب یا ان ہی تین کے متعلقات اور مبادی وآثار میں سے ہیں یا نفسِ ذات کے پردہ دار ہیں۔

قرآن کریم نے اصولی اور کلی طور پر ان تینوں کمالات کا حقیقی سرچشمہ حق تعالیٰ کو بتلاتے ہوئے سارے جہانوں پر اُس کے ان ہی تین کمالات کا احاطۂ عام ثابت فرمایا ہے۔ کمالاتِ علم وادراک کے احاطۂ عام کے بارہ میں ارشاد ہے:۔

وَاَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْماً ۔ "اور اللہ ہر چیز کو احاطۂ علمی میں لئے ہوئے ہے"

کمالاتِ وصف واخلاق کی اصل صفتِ رحمت تھی جو جمالی اخلاق کا سرچشمہ اور جلالی اخلاق کا سرمنشاء ہے اور جس کی ہمہ گیری گویا تمام اخلاق کمال کی ہمہ گیری ہے اُس کے احاطۂ عام کے بارہ میں ہے:۔

وَرَحْمَتِی وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ۔ "اور میری رحمت تمام چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے"

کمالاتِ صنعت وافعال کے احاطۂ عام کے بارہ میں فرمایا:۔

صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ ۔ "یہ خدا کا کام ہو گا جس نے ہر چیز کو (مناسب انداز پر) مضبوط بنا رکھا ہے"

غرض کمالاتِ ربانی کی یہی تین اصولی انواع ہیں جو تمام برکات ومبرّات کا سرچشمہ ہیں اس لئے قدرتی بات ہے کہ انسان اللہ کا نائب یا خلیفہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان سہ گانہ کمالات میں اُسی کے طرز کمال کا نمونہ بنکر نہ دکھلائے اور ان کمالاتِ علم وادراک، کمالاتِ وصف واخلاق اور کمالاتِ صنع وافعال کی روشنی اپنے اندر جذب کر کے اُسی انداز سے نہ پھیلائے جو اندازہ افادہ خود اُس خداوند ذوالجلال والاکرام کا ہے۔

بعثتِ انبیاء کا مقصد ان ہی کمالاتِ سہ گانہ کی ترویج وتکمیل ہے

چونکہ انبیاء علیہم السلام اوّلین خلفائے الٰہی ہیں اس لئے اُن کی بعثت کی غرض وغایت ان ہی تین کمالات "علم وخلق وصنع" سے بنی آدم کو آشنا بنانا

اور عملی طور پر اس راہ چلانا ہے تاکہ انسان خلیفۂ الٰہی بن کر اپنے منیب کی منشأ کے مطابق ان ہی تینوں کمالات کی روشنی میں اس کائنات کا انتظام کرے اور مالکِ کائنات کی مرضی پر خود چل کر اُس کی رعایا کو چلائے۔

اسی لئے سردارِ انبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کی غرض وغایت اِن ہی تین کمالات کی ترویج واشاعت ظاہر فرمائی۔ چنانچہ علمی کمالات کی ترویج کا غرضِ بعثت ہونا ان الفاظ میں ظاہر فرمایا کہ :-

انما بعثت معلماً — میں بھیجا گیا ہوں معلم بنا کر۔

اخلاقی کمالات کی ترویج کا غرضِ بعثت ہونا ان الفاظ میں ظاہر فرمایا :-

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق — میں بھیجا ہی اس لئے گیا ہوں کہ اعلیٰ ترین اخلاق کی تکمیل کر دوں۔

عملی اور صنعتی کمالات کے غرضِ بعثت ہونے کے اعلان کے لئے شریعتِ غرّا کی ترویج کو غرضِ بعثت ظاہر فرمایا جو ہر نوع کی حکمتِ عملی یعنی تہذیبی، منزلی، مدنی، عمرانی، تمدّنی، اقتصادی، سیاسی اور صنعتی وغیرہ افعال کے فطری اصول پر مشتمل ہے اور جس کے مجموعہ کا نام شریعت ہے :-

بعثت بالحنیفیة السهلة السمحة البیضاء — میں بھیجا گیا ہوں سیدھی، سہل روشن اور رعایتوں پر مشتمل شریعت دے کر۔"

قرآن حکیم نے ان تینوں مقاصدِ بعثت کو ایک مختصر آیت میں اعجازی جامعیت کے ساتھ جمع فرما کر اعلان فرمایا کہ :-

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ۔

"وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں اُن ہی (کی قوم) میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر بھیجا جو اُن کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو (عقائد باطلہ واخلاق رذیلہ سے) پاک کرتے ہیں اور اُن کو کتاب اور دانشمندی (کی باتیں) سکھلاتے ہیں۔"

اس آیت میں بعثت کی ایک غرض تلاوت وتعلیم آیات بتلائی گئی جو کمالاتِ علم کی تکمیل ہے۔ بعثت کی دوسری غرض تزکیۂ نفوس ظاہر فرمائی گئی جو کمالاتِ اخلاق کی تکمیل ہے۔ بعثت کی تیسری غرض تعلیم حکمت فرمائی گئی جو اُسوۂ حسنہ یعنی حکمتِ عملی کے ذریعہ کمالاتِ عمل کی تکمیل ہے۔ کیونکہ حکمت کے معنی حسبِ تفسیر عیسیٰ علیہ السلام علم نافع اور عمل صالح کے ہیں جیسا کہ ابن تیمیہ نے نقل کیا ہے اور علم نافع چونکہ تلاوت آیات میں آ گیا تو آگے علم صالح ہی حکمت کے مفہوم میں باقی رہ جاتا ہے۔ چنانچہ بعض مفسّرین نے حکمت کی تفسیر عملی تکمیل ہی سے کی ہے۔

پس یہ آیت اس طرح تین حکمتوں، حکمتِ علمی، حکمتِ اخلاقی اور حکمتِ عملی پر مشتمل نکلی۔ جس سے واضح ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام انبیاء کے دُنیا میں بھیجے جانے کی غرض وغایت ان ہی تین حکمتوں اور کمالوں کی علمی تشریح، اخلاقی تتمیم اور عملی تکمیل ہے جو اساسِ خلافت ہیں۔

کمالاتِ سہ گانہ کی نوعیّت

ہاں پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ بسلسلۂ منصب خلافت ان ہر سہ کمالات میں تشبّہ بالخالق کی منزلیں طے کرنے کے لئے ان کمالاتِ الٰہیّہ کی وہی نوعیت اختیار کرنی پڑے گی جو خود اُس سرچشمۂ کمالات کے یہاں اُن کی فطری نوعیت ہے تاکہ اُسی نوعیت کا علم و خلق اور صنع و عمل بہم پہنچ کر حقیقی معنی میں خلافت کا ثبوت فراہم ہو جائے اور اُس کی ضرورت نہ پڑے کہ خلافت کا شرعی لفظ اختیار کر کے اُس میں معنی اپنی طرف سے ڈالے جائیں اور حقیقی کے بجائے مصنوعی خلافت رہ جائے حقیقت تلبیس کے سوا کچھ نہ ہو اور ظاہر ہے کہ ان ہر سہ کمالاتِ الٰہیہ کی وہ اوّلین اصولی نوعیت جو ان میں بطور قدرِ مشترک یکساں طور پر پائی جاتی ہے غنائے کامل ہے جس میں غیر کی محتاجی کا ادنیٰ شائبہ تک نہیں۔

چنانچہ علم الٰہی کی پہلی اور آخری شان یہ ہے کہ وہ وسائل اور وسائط کا محتاج نہیں، وہ کسی کا نہیں بلکہ خود اپنا ہے، وہ استدلالی نہیں بلکہ ذاتی ہے کہ ماضی و مستقبل اور شاہد و غیب سب اُس کے سامنے بطورِ علم حضوری کے خود بخود حاضر ہیں۔ اُسے حصولِ علم کے لئے استدلال کی حاجت نہیں کہ وہ قیاسات سے معلومات کے اندازے لگائے کیونکہ یہ جہل کی علامت ہے اور وہ جہل سے بری و بالا ہے۔ اُسے ظن و تخمین سے نتائج تک پہنچنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ لاعلمی کا عیب ہے اور وہ ہر عیب سے منزّہ اور مقدّس ہے۔ اُسے کتابوں سے پڑھ کر اور اُستادوں سے سیکھ کر معلومات حاصل کرنے کی حاجت نہیں کیونکہ یہ ذات کا کمالات

سے خُلو اور استکمال سے ہے جو سراسر محتاجگیٔ غیر ہے اور وہ خُلو اور احتیاج سے بری ہے۔ اُسے حقائق تک پہنچنے کے لئے صورتوں، شکلوں اور محسوس ہیئتوں کی حاجت نہیں کیونکہ یہ علم بالواسطہ ہے اور وہ وسائط کی محتاجگی سے بری ہے۔ غرض علم کے دائرہ میں پہلی چیز وہاں اسبابِ علم سے غنائے مطلق ہے اسی لئے علم کے مبادی ہوں یا نتائج، ہئیت ہو یا حقیقت، صورت ہو یا ماہئیت سب وہاں بیک دم حاضر ہیں۔ نہ اُن کے اوّل میں غیر کی محتاجگی ہے نہ آخر میں۔ نہ ظاہر میں نہ باطن میں، کیونکہ وہ خود ہی ہر چیز کا اوّل ہے اور خود ہی آخر خود ہی ظاہر ہے اور خود ہی باطن، هو الاول ليس قبله شئی وهو الآخر ليس بعده شئی وهو الظاهر ليس فوقه شئی وهو الباطن ليس دونه شئی اس لئے علم الٰہی کی اساس غنائے مطلق ٹھہر جاتی ہے۔ چنانچہ علم کے دائرہ میں اللہ کے حقیقی خلفاء وہی ہو سکتے ہیں جن کے علم کی شان یہ غنائے کامل ہو کہ وہ یا تو بلا کسب و اکتساب اور بلا واسطۂ کتاب و استاد نیز بلا ریاضت و مجاہدہ وہبی اور الہامی طور پر براہِ راست اللہ سے اُس کا علم پائیں جس کا نام علمِ لدُنی ہے جو انبیاء علیہم السّلام کی شان ہے اور یا پھر کسب و ریاضت بھی اگر ہو تو انبیاء ہی کے تعلیم کردہ اصول و طرق اور اُن ہی کے پیش کردہ اُسوہ کے مطابق جن پر چل کر یہ علم اگرچہ ابتداءً کسبی اور حصولی کہلائے مگر آخر کار علم الٰہی سے ایک نسبت پیدا کر کے وہبی بن جائے اور خود قلبِ صافی ہی میں سے علم کا چشمہ پھوٹ نکلے جس میں وہی شانِ غنا رآجائے کہ نہ اس میں رسمی وسائط کی احتیاج باقی رہے، نہ کتاب و استاد اور دوسرے وسائلِ تعلیم کی حاجت رہے جو

اولیائے اُمّت، ائمہ ملّت اور صلحائے قوم کی شان ہے ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

ہاں پھر علم ہی کی طرح یہی صورت اخلاقِ ربانی کی بھی ہے کہ اُن کا منتہا بھی درحقیقت یہی غنائے کامل ہے جو اس اخلاقی خلافت کی اساس ہے۔ یعنی ہر خُلقِ حَسَن کی روح آخر میں یہی غناء اور عدم احتیاج نکلتی ہے جیسا کہ ہر بدخُلقی کی روح انجام کار محتاجگی اور غیر کی غلامی اور اسیری نکلتی ہے۔ مثلاً تواضع للہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم سمی جاہ اور خودی سے کنارہ کش اور بے نیاز ہیں۔ سخاوت و قناعت کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم مال و منال کی محبّت و طلب سے آزاد اور بے پرواہ ہیں۔ صبر کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہمیں فوت شدہ کا غم نہیں یعنی ہمیں اس کی احتیاج نہیں، شکر کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم اس نعمت سے اٹکے ہوئے نہیں بلکہ منعم سے وابستہ ہیں جو سرچشمۂ غناء ہے۔ شجاعت کے معنی ہی جان سے بے نیازی اور استغناء کے ہیں۔ حیاء کے معنی ہی حق کی خاطر مرغوباتِ نفس سے بے پرواہ ہو جانے کے ہیں۔ ایثار کے معنی ہی دوسرے کے نفع کی خاطر اپنے منافع سے دستبردار اور بے نیاز ہو جانے کے ہیں۔ حلم کے معنی ہی انتقام سے بے نیازی اور جذباتِ انتقام سے بالاتر ہو جانے کے ہیں۔ عفو و درگزر کے معنی ہی حق کی خاطر سزا و تعزیر سے بے نیازی برتنے کے ہیں۔

غرض ہر خُلقِ حَسَن کی روح آخر میں غناء اور غیر محتاجگی نکلتی ہے کہیں اپنے سے کہیں دوسرے سے، کہیں اپنے حقوق سے، کہیں دوسرے کے حقوق پر دست درازی سے اور اس کے بالمقابل اخلاقِ حَسَنہ کی اضداد یعنی ہر بدخُلقی کی بُنیاد جبلی

طور پر محتاجگی اور غیر کی اسیری نکلتی ہے۔ مثلاً تواضع کے مقابلہ میں تعلّی کے معنی غیر پر اپنا تفوّق جتانے کے ہیں جو سراسر غیر کی محتاجگی ہے۔ کیونکہ غیر نہ ہو تو تفوّق کس پر جتایا جائے؟ لہٰذا غیر کی محتاجگی ہوئی۔ پھر وہ ہمیں اپنے سے فائق خیال نہ کرے تو یہ تعلّی کامیاب کیسے ہو؟ لہٰذا غیر کے خیال تک کی محتاجگی ہوئی۔ اس لئے تعلّی اور شیخی سرتاپا احتیاجِ غیر نکلتی ہے جو ہمیں دوسرے کا اسیر اور قیدی بنا دیتی ہے جسے ہم غلط فہمی سے عزّت تصوّر کرنے لگتے ہیں حالانکہ وہ انتہائی ذلّت اور ذلّتوں کی جڑ بنیاد ہے۔ یا مثلاً سخاوت کے مقابلہ میں بخل کے معنی مالی محتاجگی کے ہیں نہ کہ اُس سے غنی اور آزاد ہو جانے کے۔ بے صبری اور جزع فزع کے معنی فوت شدہ سے اٹکاؤ اور اُس کے غم میں گھل جانے کے ہیں کہ اُس کے بغیر چین و قرار نہیں۔ اگر اُس سے غنی ہوتے تو یہ بے چینی کیوں ہوتی؟ یہی اُس کی محتاجگی اور غلامی ہے۔ جبن و بُزدلی کے معنی مقابل کی صورت سے متاثر ہو کر اس کی طاقت سے دب جانے کے ہیں اور تاثر ہی محتاجگی ہے۔ ناشکری اور کفرانِ نعمت کے معنی سرچشمۂ نعمت یعنی مُنعم سے کٹ کر خود اپنے بے نعمت نفس کی اسیری اور غلامی کے ہیں جو خود بذاتہ اس نعمت سے محروم تھا ورنہ دوسرے سے نعمت کا خواہاں اور حاصل کنندہ کیوں ہوتا؟ اور محرومی و مفلسی یا عطائے غیر کی احتیاج ہی غیر کی اسیری ہے جو سرتاسر ذلّتِ نفس ہے۔ حرص کے معنی دولت اور اسبابِ شہوت کی محتاجگی کے ہیں۔ بے حیائی اور فحش کے معنی عقل و شرع سے الگ ہو کر خواہشِ نفس کی پیروی کے ہیں اور نفس بالطبع جاہل اور بے تمیز ہے۔ گویا سرچشمۂ جہالت کی محتاجگی اور اسیری کے ہیں جو بہت بڑی ذلّت ہے۔

غرض ہر بد خلاقی محتاجگیٔ غیر اور ذلت کی جڑ ہے اور ہر نیک خُلق غنائے نفس، عزت و خودی اور وقار و خودداری کی اساس ہے۔ ظاہر ہے کہ جب حق تعالےٰ شانہٗ کی ذاتِ بابرکات تمام اخلاقِ حَسَنَہ کا سرچشمہ اور معدن ہے تو غنائے مطلق اور صمدیت کا سرچشمہ بھی وہی ہو سکتا ہے اور اُس کا یہ غناء بھی اُس کی ذاتِ لامحدود کی طرح لامحدود ہی ہو گا۔ یعنی بے نیازی سارے جہانوں اور جہانوں کی ایک ایک چیز سے ہو گی، کائنات اور کائنات کے سارے وسائل سے ہو گی اسی لئے اُس نے اپنی شان خود ہی ارشاد فرمائی کہ :-

وَاِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ہ "اور بلاشبہ اللہ سارے جہانوں سے بے پرواہ ہے"

یعنی وہ کسی چیز سے اٹکا ہُوا نہیں۔ اسی لئے اُس کی عزت اور اُس کا اقتدار بھی جہانوں کے ذرہ ذرہ پر چھایا ہُوا ہے اور اسی لئے اُس نے اپنا نام صمد بتلایا ہے جس کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اُس کے ہی محتاج ہیں۔ اِس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب یہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں کہ اخلاق کے سلسلہ میں اللہ کا نائب اور خلیفہ وہی ہو سکتا ہے جو اِن اخلاقِ الٰہیہ صبر و شکر جود و کرم، رافت و رحمت، محبتِ حق، قوت و متانت وغیرہ سے منصبغ ہو کر سارے جہانوں اور جہانوں کی ایک ایک چیز سے بے نیاز اور غنی بن جائے اور بالفاظِ مختصر اپنے خالق کی غنائے کامل کا مظہرِ اتم بن کر اللہ کے سوا کسی غیر اللہ کا محتاج نہ رہے، بے نیازی، بے لوثی اور استغنائے کلی اُس کے چہرے، مہرے، اُس کی ہر حرکت و سکون اور اُس کے اقوال و افعال سے [illegible] ہو اور اس غنائے کامل سے اُس کا باطن اور اندرون مطمئن،

منشرح اور آسودہ ہو کر ہر غیر سے آزاد ہو جائے۔ نہ اُس کی عزت و جاہ کسی کے خیال پر موقوف ہو۔ نہ اُس کا حظ و نصیب کسی غیر کی عنایت پر معلق ہو، نہ اُس کے بسط و انبساط اور فرح و سرور وغیرہ کسی غیر سے اٹکے ہوئے ہوں جن کے زوال کا خطرہ اُسے فکرمند بنا کر اُسے غیر کا اسیر بنا دے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اخلاقی خلافت بھی آخر کار اُسی غنائے نفس پر قائم نکلی، جس پر علمی خلافت کی تعمیر کھڑی ہوئی تھی اور ظاہر ہے کہ جب انسان ان عنصری وسائل اور مادی حوائج سے قلباً مستغنی ہُوئے بغیر خداوندی اخلاق کے غناء کا ابتدائی نمونہ بھی قائم نہیں کر سکتا جو اخلاقی خلافت کے لئے خشتِ اوّل ہے تو نا ممکن ہے کہ وہ خدائے برتر کی اخلاقی خلافت کا مستحق ٹھہر جائے اور اُس میں ان اخلاقِ ربّانی کے نور سے ہر غیر اللہ سے قلبی استغناء کا ظہور نہ ہو اور وہ اخلاقی طور پر محتاجگیٔ غیر کی اُن دلدلوں سے باہر نہ نکل آئے جن کی ابھی سرسری تفصیلات عرض کی گئیں۔ اب خواہ یہ غیر اللہ جبال و بحار ہوں یا برق و بُخار، آب و آتش ہوں یا خاک و باد۔ پھر ان کے موالیدِ ثلاثہ جمادات نباتات حیوانات ہوں' یا اجناسِ خمسہ۔ پس کہاں ان مادیات کی غلامی و اسیری میں بندرہ کر اس غلامی پر فخر کرنیوالے اور کہاں خلافتِ الٰہی جس کے معنی ہی ان اشیاء سے آزادی، غیر محتاجگی اور غلامی شکنی کے ہیں۔ شتان بین مشرق و مغرب۔

ہاں پھر اسی طرح جو نوعیت علم و اخلاقِ الٰہی اور اُن کی خلافت کی ہے، وہی بعینہٖ خدائی صنعت و ایجاد اور فعالی کی بھی ہے کیونکہ اُس کی اساس بھی یہی غنائے کامل اور غیر محتاجگیٔ غیر ہے۔ یعنی اللہ کا کوئی فعل اور اُس کی

کوئی صنعت نہ وسائل کی محتاج ہے نہ اسباب کے تابع ہے، وہ خود ہی مسبب الاسباب ہے اور خود ہی مسئول الوسائل ہے۔ تمام افعال کو اُسی کی باطنی قوت نمایاں کرتی ہے جس میں نہ مادّہ درکار ہوتا ہے نہ مُدّت۔ خود اُسی کی باطنی طاقت ایک فعل کو ذہنی وجود دے کر اُسے بیک دم خارج میں نمایاں کرتی ہے جس کے لئے یہ اسباب و مسببات کا سلسلہ ضروری نہیں۔ بلکہ صرف کُن فَیَکُوْن کی لامحدود طاقت سے یہ افعال بروئے کار آتے ہیں اور اگر اس ظاہری عالَم میں اُس کے افعال بذیلِ اسباب بھی نمایاں ہوتے ہیں تو خود اسباب کا وجود بھی فوری اور آنی طور پر اُسی کُن فَیکُونی قوت سے نمایاں ہوتا رہتا ہے۔

غرض افعالِ خداوندی میں اسباب و مسببات کا سلسلہ یا مادّہ و مدّت، کا علاقہ یا زمان و مکان کا رابطہ کسی محتاجگی کے سبب سے نہیں بلکہ حکمت کے ماتحت ہے جو مخلوق کے ضعیف نفوس کی تسلّی اور سہولت کے لئے قائم کیا گیا ہے اور اُسی کی تخلیق و ایجاد سے ہے ورنہ قدرتِ مطلقہ کو ان سلسلوں کی قطعاً حاجت نہیں، اسی لئے خوارِق عادت یعنی معجزات یا کرامات یا ارہاصات یا وقتی غیر معمولی حوادث کا باب قائم کر کے اور ہر کلّیہ میں مستثنیات رکھ کر نیز ہر دائرہ میں اختلاف و تضاد ڈال کر قدرتِ مطلقہ اور غیر محتاجگیٔ وسائل کا کھلا عملی اعلان بھی فرما دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب صنائع خداوندی کی اصل شان وسائل سے غنا رہے اور اختیارِ وسائل محض حکمت و مصلحت کے لئے ہے اور وہ بھی ایجادِ وسائل کے ساتھ نہ کہ محض استعمالِ وسائل کے ساتھ تو انسان کو بھی حقیقی طور پر صنعتی خلافت اُس وقت تک میسّر نہیں آسکتی جب تک کہ اُس کے

صُنع و عمل کی قوتیں بھی اسباب و مسببات اور زمان و مکان کی قیود سے بے نیاز ہو کر اُسی کُنْ فَیَکُوْنی انداز کی نہ ہو جائیں جیسی خود اُس صانع عَالَم کی ہیں۔ نیز حقیقی معنی میں انسان اُس وقت تک نائبِ صنعت و فعالی قرار نہیں پا سکتا، جب تک کہ ان وسائل ظاہری سے اُسے ایسا غنا میسّر نہ آجائے کہ مادہ و مدّت اُس کے کاموں میں کوئی توقف پیدا کر نہ سکیں اور وہ اپنے صنع و عمل میں کسی غیر اللہ کا محتاج نہ رہے خواہ وہ بے شعور وسائل ہوں یا باشعور اشخاص و اعیان عناصر و موالید ہوں یا فلکیات و ارضیات، یہ تمام اشیاء نہ اُس کی صنعت میں حارج ہو سکیں نہ اُس کی کسی صنعت کا موقوف علیہ بن سکیں۔ وہ چاہے تو بلا وسائلِ پرواز محض خدا کی طاقت کے بھروسہ اور اپنی قوتِ یقین سے آسمانوں تک پرواز کر سکے اور چاہے تو بلا وسائلِ رصدگاہ اپنے اثرات فلکیات تک پہنچا دے۔ وہ چاہے تو بلا وسیلہ لاسلکی اپنی صدا مشرق سے مغرب تک پہنچا دے اور چاہے تو فرشِ زمین پر بیٹھ کر فرش ہی کی نہیں عرش کی خبریں لے آئے وغیرہ۔

غرض اُس کی ہر صنعت و کارگزاری خود اُسی کی قوتِ متخیلہ و تصوّر کے تابع ہو جائے کہ جو دھیان باندھ لے وہ واقعہ بن کر سامنے آجائے۔ گویا یہ خارجی عَالَم اُس کا ایک خیال بن جائے کہ اُس کی خیالی جنبش اجزائے عالم کو جنبش میں لے آئے۔ یعنی وہ اپنے کام میں باہر کا تابع نہ رہے بلکہ ہر بیرون اُس کے اندرون کا تابع ہو جائے جس کا حاصل وہی کمالِ غناء نکلتا ہے جس سے نفس ہی اپنی معنوی قوت سے بڑے بڑے افعال بروئے کار لا سکے جس میں کسی مادی وسیلہ کی محتاجگی نہ رہے۔ یہ جُدا بات ہے کہ ایسا قویُّ المعنویت بندہ اپنی شانِ

عبدیت نمایاں رکھنے کے لئے اس غناء کا مظاہرہ نہ کرے اور پیش حق باذن حق اپنی شانِ ادب قائم رکھنے کے لئے عوام کی طرح اسباب و وسائل کا پابند بنا رہے اور جب بھی اس قوت کو کام میں لائے تو بایمائے حق استعمال کرے تاکہ اس غناء کے ساتھ بھی اللہ کے سامنے اُس کی محتاجگی اور بندگی غیر مشتبہ طور پر پیش ہوتی رہے لیکن ظاہر ہے کہ صنعتی خلافت کا یہ اعلیٰ ترین مقام کہ صنعت وکسب میں اعتقاداً وعملاً اسباب و وسائل کی حاجت باقی نہ رہے اور صرف ادباً و اتباعاً ہی اُنہیں اختیار کیا جائے یقیناً کاملین کا حصہ ہے، مگر اس خلافت کا وہ مقام جو ہر قابلِ خلافت مومن کے لئے ضروری ہے یہ ہے کہ اگر وہ عملاً اسباب و وسائل سے مستغنی نہیں تو کم از کم اعتقاداً اُن کی محتاجگی کے دلدل سے نکلا ہُوا ہو یعنی اگر ہاتھ پیرِ اسباب سے بے نیاز نہ ہوں تو کم از کم دل بے نیاز ہو اور اُس میں یہ یقین صادق موجزن ہو کہ اسباب و وسائل محض حیلے ہیں جو طفل تسلّی کے طور پر ہمارے ضعیف الیقین نفوس کے سہارے کے لئے رکھ دیئے گئے ہیں جن میں بذاتہٖ کوئی ادنیٰ تاثیر نہیں۔ مؤثرِ حقیقی صرف حق تعالےٰ شانہٗ کی ذات بابرکات ہے۔

پس ایسے خلفاء میں اگر ترکِ اسباب سے صنعت گری کی قوت نہیں تو دل سے اعتقاد رکھنے کی قوت بہرحال موجود ہوتی ہے جو اُن کے ظاہر کو نہیں تو کم از کم باطن کو ضرور مستغنی رکھتی ہے اور اگر ظاہری خلافت اُن کے حصہ میں نہ آئے تو باطنی خلافت اُن کا نصیبہ بن جاتی ہے۔ البتہ اَلظَّاہِرُ عُنْوَانُ الْبَاطِن کے اصول پر اُن کی عملی زندگی اس اعتقاد کا رنگ لئے بغیر نہیں رہتی اور وہ اسباب

طبعیہ کی طرف اگر جھکتے بھی ہیں تو کسی شغف و انہماک یا اس محتاجگی پر فخر ومباہات کے جذبات کے ساتھ نہیں بلکہ اَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ وَتَوَکَّلُوْا عَلَیْہِ کی روشنی میں اس علمی طلب اور اختیارِ اسباب پر بقدرِ ضرورت ہی متوجہ ہوتے ہیں۔ دلِ اُن کا غنی رہتا ہے۔ البتہ اُن کے اس علمی و اعتقادی استغناء کی بدولت یہ وسائل واسباب سے بے نیازی کا ذخیرہ نفس میں تدریجاً جمع ہوتا رہتا ہے اور آخرت میں ایک دم یکجا ہو کر بالآخر اُن میں بھی وہی کُنْ فَیَکُوْنُ کی شان پیدا کر دے گا۔ اور اُن کی باطنی قوت غنا قوتِ متخیلہ پر اس درجہ حاوی ہو جائے گی کہ وہ جو خیال باندھیں گے وہی متشکل ہو کر سامنے آ جائے گا اور جو چاہیں گے وہ بلا توسطِ اسباب اچانک ہو جائے گا۔ پس یہ دُنیا کی خلافتِ باطنی وہاں حقیقی خلافت بن جائے گی اور وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ کا کھلا ظہور ہو جائے گا۔

بہرحال صنع وعمل میں اسبابِ مادی سے بے نیازی صنعتی خلافت کی روح ہے خواہ اس کا مکمل ظہور عملی طور پر دُنیا ہی میں ہو جائے جو شانِ انبیاء و اولیاءؑ ہے یا اعتقاد کی قوت سے آخرت میں نمایاں ہو جبکہ صلحائے اُمّت اس غنائے قلبی کو بذریعۂ اعتقاد جزو نفس بنالیں۔ پس جوں ہی مکنوناتِ نفس کے کُھلنے کا دن (یومِ قیامت) آجائے گا مومن کی یہ اعتقادی قوتیں عملی طور پر نمایاں ہو جائیں گی اور اُس کی خلافت کاملہ کا ظہور ہو جائے گا، جو درحقیقت اسی دنیاوی خلافت کا اُبھار اور بروز ہوگا۔

غرض صنعت وافعال میں خلافتِ الٰہی اُسی وقت نصیب ہو سکتی ہے جبکہ

انسان وسائلِ مادیہ کا دریوزہ گر نہ رہے، خواہ حالاً، خواہ استدلالاً، خواہ اعتقاداً بلکہ خود وسائل اُس کے دریوزہ گر اور طالب بنا دیئے جائیں جو غنیٌّ عَنِ العٰلَمِیْن کی شان ہے۔

پس صنعتی خلافت کی اساس و بُنیاد بھی وہی غنا اور ماسویٰ اللہ سے بے نیازی نکلی جو علم و اخلاق کی خلافت کی بُنیاد تھی۔ اور واضح ہو گیا کہ وسائل سے غنی ہوئے بغیر یا انہیں غیر مؤثر بالذات یقین کئے بغیر اور پھر ان میں انہماک و شغف اور مبالغوں کو ترک کئے بغیر صنعتِ الٰہی کی خلافت میسّر نہیں آسکتی اور جبکہ خلافت کی روح ہی غنا و توکل ٹھہری تو جس درجہ کے غنا و توکل کی طاقت ہو گی اُسی درجہ کی طاقت کی خلافت بھی ہو گی۔ خواہ وہ علمی خلافت ہو یا اخلاقی اور صنعتی ہو۔

مثلاً اگر حق تعالےٰ کے بارہ میں قوتِ یقین و اعتمادِ عین الیقین کے مرتبہ پر فائز ہونے کے سبب یہ غناء و توکل درجۂ حال میں ہو جس کی جڑیں قلب و قالب کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر ملکۂ راسخہ کی شکل اختیار کر چکی ہوں تو خلافتِ حقیقی ظاہراً و باطناً مستحکم ہو گی جس میں علم اور اخلاق و صنعت اسبابِ ظاہری سے کلیتہً بے نیاز ہوں گے اور اختیارِ اسباب محض امتثالِ امر اور محض آدابِ عبودیت کے لئے ہو گا نہ کہ احتیاج کی بنا پر، کیونکہ وہاں جنودِ ملائکہ کی نصرت اور خود اُن نفوسِ طیّبہ کی ومارمیت اذ رمیت والی اعجازی قوّت ساتھ ہو گی جس سے اُن کی احتیاج صرف ذاتِ حق سے وابستہ ہو گی کسی غیر سے نہیں۔ یہ خلافتِ انبیاء و اولیاء کی ہے۔ اسی کے تحت غزوۂ بدر میں ملائکہ مسوّمین ہزاروں کی تعداد میں آئے تاکہ ان قلیل التعداد

مجاہدوں کے دلوں میں جماؤ اور استقلال پیدا کریں۔ اسی کے تحت حضورؐ نے اعداءُ اللہ پر مٹھی بھر کنکریاں پھینک ماریں جو انہیں تیر و تفنگ ہو کر لگیں۔ اسی کے تحت حضرت خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلّم نے غزوۂ موتہ کا جو شام میں ہوا، مدینہ ہی میں مشاہدہ فرماتے ہوئے اعلان فرمایا تھا کہ لڑائی کا جھنڈا اب زیدؓ بن حارثہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ شہید ہو گئے۔ اور اب جعفر طیارؓ کے ہاتھ میں آیا اور وہ شہید ہو گئے اور اب عبداللہؓ بن رواحہ کے ہاتھ میں آیا اور وہ بھی شہید ہو گئے اور اب خالدؓ کے ہاتھ میں آیا اور وہ کامیاب ہو گئے۔ نیز اسی کے ماتحت فاروق اعظمؓ نے ممبر پر خطبہ پڑھتے پڑھتے ایک دم شام کی جنگ کی کمان شروع کر دی تھی اور مدینہ سے ڈھائی سو میل کے فاصلہ پر بغیر کسی لاسلکی کی مدد کے "یاساریۃ الجبل" کی آواز پہنچا کر جنگ کا رُخ بدل دیا تھا۔ اسی قوتِ غناء کے ماتحت بعدِ وفاتِ نبویؐ عرب کے ارتداد کے موقع پر صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ تمام عرب کے مرتدین کے مقابلہ پر تن تنہا جنگ کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے اور اسی قوت کے بل بوتہ پر چین کے کروڑوں انسانوں کو صرف دس پانچ ہی تاجر صحابہ نے جنگت کا الٹی میٹم دے دیا تھا اور اسی قوّت کے ماتحت رومیوں کی ساٹھ ہزار فوج کو حضرت خالدؓ نے صرف ساٹھ صحابہ کے لشکر سے شکست دے دی تھی۔

اسی قوت کی بناء پر قرآن نے فرمایا تھا کہ اگر تم میں بیسؔ صابر و متوکل ہوں تو دوسوؔ پر غالب ہوں گے اور سو ہوں گے تو ایک ہزار کے لئے کافی ہونگے۔ اسی قوت کے ماتحت حضور صلی اللہ علیہ وسلّم صومِ وصال رکھ کر ہفتوں کھانا پینا

ترک فرمادیتے۔ دو دو ماہ بیتِ نبوّت سے دُھواں نہ اُٹھا اور بقائے حیات کے بارے میں فرماتے :۔

یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ ۔ " میرا پروردگار مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔"

اسی قوتِ غناء کے ماتحت اولیائے اُمّت کے زہد و ترک کی قوتیں کارفرما ہوئی ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند نے اپنی آخر عمر میں فرمایا کہ " الحمد للہ ! اب مجھے بقائے حیات کے لئے کھانے پینے کی ضرورت نہیں رہی صرف اتباعِ سُنّت کے لئے کھاتا پیتا ہوں "۔ یعنی ذکر اللہ ہی غذا کے قائم مقام ہوگیا ہے۔ اسی قوت کے تحت صحابۂ کرام لمبے لمبے فاقوں کے ساتھ اور کبھی محض کھجور کی گٹھلیوں کو منہ میں ڈال کر چوستے رہنے کے ساتھ مسلسل جہاد اور جنگ میں مصروف رہتے تھے اور معمولی سے معمولی ہتھیاروں کم سے کم تعداد اور بے سروسامانی کے ساتھ وقت کی باقاعدہ مرتّب کیل کانٹے سے لیس اور بھاری تعداد کی فوجوں کے ساتھ فاتحانہ جنگ کرتے تھے۔ بلاشبہ یہ جنگیں اور یہ احوالِ زہد و قناعت، مادّی وسائل کے رہینِ منّت نہ تھے بلکہ قلبی جوشِ اعتقاد اور قوتِ یقین کے آثار تھے جس میں اسباب سے کمالِ استغناء اور مسبب الاسباب سے کمالِ ربط و احتیاج تھی۔ پس یہ خلافت انبیاء و اولیاء کی ہے۔

ہاں اگر قوتِ یقین عین الیقین کے درجہ کی نہ ہو اور غناء و توکل کا مادّہ راسخہ قلب میں جڑ پکڑے ہوئے نہ ہو لیکن پھر بھی حق الیقین کے تحت غناء و توکل کی بشاشت و طمانیت قلب میں پھیلی ہوئی ہو۔ قلب میں انشراح

ہو، جس میں علم و اخلاق اور صناعات گو ظاہراً تو اسباب سے بے نیاز نہ ہوں مگر اعتقاداً ان اسباب و وسائل کی اہمیت و وقعت پرِ کاہ کے برابر بھی نہ ہو اور اسباب اختیار کرتے وقت یہ تصوّر قلب میں راسخ ہو کہ یہ اسباب محض ہمارے ضعیف نفوس کو سہارا دینے کے لئے رکھ دیئے گئے ہیں فی نفسہٖ انہیں کسی ادنیٰ تاثیر کی مجال نہیں ہے اور نہ ہی ان اسباب و مسبّبات میں کوئی عقلی لزوم ہے کہ اسباب پر نتائج مرتب ہونے ضروری ہوں، بلکہ یہ سارا کارخانہ مشیتِ ایزدی کے تابع ہے۔ وہ جب چاہے ان اسباب پر نتائج مرتب فرمادے اور جب چاہے روک دے۔ اس لئے اعتماد و بھروسہ کے لائق اسباب نہیں صرف مسبب الاسباب کی ذات بابرکات ہے، تو یہ خلافت صلحائے اُمّت کی ہوگی جن کا قلب کم سے کم علم و عمل اور صناعات میں محتاجگیٔ وسائل سے خالی ہوگا۔ گو اعضاء و جوارح خالی نہ ہوں۔ اس قسم کے خلفائے عادل تمام واہمی اور واقعی خطرات سے نڈر ہوکر قانونِ شریعت پر چلتے اور چلاتے ہیں اور اوامرِ الٰہیہ کے مقابلہ میں مخالفِ حق اسباب کا ہجوم انہیں خوفزدہ نہیں کرسکتا، بلکہ وہ یک رُخ ہوکر ایسے تمام مادّی وسائل کو پسِ پُشت ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ پس یہ خلافت گو حقیقی نہیں ظاہری ہے مگر شبہ حقیقی ضرور ہوگی۔ اُمرائے عادل کے بہت سے حیرتناک تاریخی کارنامے اسی اعتقادی قوتِ غناء و یک رُخی کے آثار ہیں جن سے اوراقِ تاریخ پُر ہیں۔

پھر اگر یہ غناء و توکل محض ایک خیال کی صورت سے قلب میں آمدورفت اور گزر تو رکھتا ہے، مگر نہ تو جڑ پکڑے ہوئے ہے، نہ انشراح میں ہے اور نہ

اُس کی بشاشت ہی قلب میں پھیلی ہوئی ہے۔ گویا بسلسلۂ اعتقاد اللہ کے معاملات میں نہ عین الیقین ہے نہ حق الیقین، بلکہ ایک اجمالی علم الیقین ہے جس سے یہ دھیان تو آتا رہتا ہے کہ اسباب میں تاثیر خدا کی طرف سے ہے لیکن اُس کی کسی کیفیت سے قلب آشنا نہیں جو علم و اخلاق اور صناعات میں بے نیازیٔ اسباب کی عزیمت پیدا کرے تو یہ خلافت عوام مسلمین کی ہوگی جو درحقیقت خلافتِ ظاہری بھی نہیں بلکہ خلافتِ ظاہری کا ایک بے جان ڈھانچہ اور کاغذی تصویر ہے جس میں علم و اخلاق اور صناعات، سب کے سب شدّت کے ساتھ اسبابِ ظاہری کے پابند ہوں گے اور اسباب و وسائل کے بے اثر ہونے کی طرف کوئی ذہنی التفات نہ ہوگا بلکہ اسباب و مسببات میں لزوم کا تصوّر ہر وقت ذہن پر چھایا ہُوا ہوگا جس سے مسبب الاسباب پر بھروسہ اور اطمینان کی وہ کیفیت نہ ہوگی جو مطلوب ہے، گو اُس کی تکذیب بھی ذہن میں نہ ہوگی۔ اس درجہ کے اُمراء و خلفاء معاشی مہمات اور بقائے اقتدار کی ضروریات میں تو چاق و چوبند ہوتے ہیں، لیکن اللہ کے معاملات میں سُست، پس وپیش کا شکار اور رسمی اندیشوں اور مصلحت آفرینیوں میں گرفتار ہوں گے اور کبھی بھی اپنے داعیۂ باطن سے خلافت کے حقیقی نصب العین کے احیاء و تکمیل کی طرف مائل نہ ہوں گے۔ یوں اتفاقاتِ وقت اور احوال و عوارض کی مجبوریوں سے اعلائے کلمۃ اللہ کا کوئی کام اُن سے سرزد ہو جائے تو یہ احوال کا نتیجہ ہوگا خود اُن کے کسی عزم و حزم کا ثمرہ نہیں ہوگا۔

اور اگر غناء و توکل صرف درجۂ قال میں نوکِ زباں ہے، قلب میں اُس کا

کوئی ریشہ جاگزین نہیں اور یہ قالِ بے حال بھی کئی روایتی مجبوری یا زوالِ اقتدار کے خوف یا مسلم قومیت سے خارج سمجھ لئے جانے کے خطرہ سے ہے گویا زبان سے یہ کہنا بھی کہ

"کرتا دھرتا خدا ہی ہے، اسباب میں کیا رکھا ہوا ہے"۔

بطور یرضونکم بافواھھم وتأبیٰ قلوبھم (زبانوں سے تمہیں راضی رکھنا چاہتے ہیں اور دل اُن کے اس سے انکاری ہیں) کے ہو تو یہاں نہ صرف اسبابِ ظاہری کی اسیری اور محتاجگی ہی ہوگی بلکہ اُن ہی پر پورا بھروسہ اور اعتماد بھی ہوگا اور اُن کے ہونے نہ ہونے پر ہی قلب کی تسکین اور تشویش کا مدار ہوگا۔ نیز اسباب میں یہ غُلو اور مبالغہ ہی مسبّبُ الاسباب سے بیگانگی اور بے تعلقی کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

پس یہ خلافت نہیں صرف ادعائے خلافت ہوگا یعنی خلافتِ قالی ہوگی جو قوتِ یقین کے کالعدم ہونے کے سبب محض صورتِ یقین سے زبانی دعوؤں کی شکل میں سرزد ہوگی۔ ظاہر ہے کہ جو نوعیت اُس اسلام کی ہے جو صرف زبان پر ہو، دِل میں نہ ہو وہی نوعیت اس خلافت کی بھی ہوگی اور اس کے بعد کُھلے کفر کا مقام ہے جہاں صرف بندگیٔ اسباب ہے، عبادتِ مسبّب الاسباب نہیں، سو اُس میں خلافت یا غناء و توکل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تمام قلبی جذبات اور باطنی ہئیات عمل سے کُھل جاتی ہیں اور عمل ہی ان قلبی مقامات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

بہرحال اس تقریر سے خلافت کی نوعیت اور اُس کے مراتب و درجات کے ساتھ ساتھ اُس کی اصل رُوح کی وضاحت بھی ہوگئی کہ وہ غناء، توکل اور بے نیازیٔ

اسباب ہے اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ خلافتِ الٰہی کے معنی علم و عمل اور صنعت و افعال وغیرہ میں مادی اسباب سے منقطع ہونے کے نہیں بلکہ عملاً یا اعتقاداً اُن سے بے نیاز ہو جانے کے ہیں۔ جیسا کہ خود حق تعالےٰ شانہ نے بھی اس غنائے مطلق کے باوجود اسباب بھی پیدا کئے اور اپنی قوتوں کو عادۃً اُن ہی کے ضمن میں نمایاں بھی فرمایا۔ اس لئے اسبابِ جنگ کے سلسلہ میں ہتھیار، اسباب صنائع کے سلسلہ میں اوزار اور اسبابِ معاش کے سلسلہ میں کاروبار، اپنی اپنی جگہ رہے گا، مگر نہ دِل میں ان وسائل کی اہمیت اور محتاجگی ہو گی اور نہ عملاً اختیارِ وسائل میں غُلو اور مبالغہ۔ اس لئے واعدّ والھم ما استطعتم کے فرمانِ قدسی نشان پر اُس سے کوئی اثر نہ پڑے گا۔ دشمنانِ حق و صداقت کے مقابلہ میں یہ اعدادِ مستطاع (امکانی تیاری) اپنی جگہ رہے گی اور وہ قلبی غناء اور عملی عدم مبالغہ اپنی جگہ۔

پس آیتِ کریمہ نے امکانی تیاری کا حکم دیا ہے اُس کی نوعیت اور کیفیت پر روشنی نہیں ڈالی کہ وہ کتنی اور کیسی ہونی چاہیئے۔ اس لئے اس امکانی تیاری کی ہدایت تو اس آیت سے حاصل کی جائے گی اور اس کی نوعیت و کیفیت انبیاء علیہم السّلام کے طرزِ عمل اور اولیاء و صلحاء کے طرزِ اتباع سے اخذ کی جائے گی اور وہ وہی غنا آمیز جد وجہد ہو گی جس پر سابق میں چند واقعات سے روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

پھر یہ صرف شرعی ہی حقیقت نہیں بلکہ دُنیا کے عُرفِ عام میں بھی غناء ہی کو کمال سمجھا گیا ہے۔ یعنی کمال وہی مانا گیا ہے جو نفس کا جوہر ہو اور اپنے ظہور

میں نہ وسائلِ ظاہری پر معلق ہو نہ اُن کا محتاج ہو۔ ایک فنونِ جنگ سے واقف کار سپاہی جو ہتھیار چلانا جانتا ہے، یقیناً اُس ناواقف سے بڑھا ہُوا سمجھا گیا ہے جو ہتھیار اٹھانا بھی نہیں جانتا۔ کیونکہ اوّل الذکر اپنی حفاظت میں دوسرے کا محتاج نہیں اور ثانی الذکر ہے۔ پس بنائے فضیلت وہی غناء نکلا۔

پھر اس سے بھی برتر وہ ہے جو نہتّہ ہونے کے باوجود محض ہاتھ کے داؤ پیچ سے دوسرے کے ہتھیار چھین کر اُسے نہتّہ کر دے اور خود مسلّح ہو جائے کیونکہ وہ ہتھیار کا بھی محتاج نہ نکلا جو پہلے غنا ر سے اُونچا غناء ہے۔

اس سے بھی آگے وہ ہے جو نفس کی کسی اندرونی طاقت مثلاً نگاہ کو ریاضت سے مضبوط بنا کر محض آنکھ سے گھُور کر ہی حریف کو گرا لے اور نگاہ سے پتھر تک توڑ ڈالے، جیسے مسمریزم والے کرتے ہیں۔ پس یہ ہتھیار تو کجا ہاتھ پیر ہلانے کا بھی محتاج نہ رہا۔

اس سے بھی بڑھ کر وہ سمجھا گیا ہے جو قوتِ خیال کی طاقت سے چند کلمات ہی کے ذریعہ دشمن کو زیر کر دے جیسے سحر کی طاقت ہے جسے ریاضت سے حاصل کر لیا جاتا ہے۔ پس یہ ہتھیار، ہاتھ پَیر اور آنکھ کا بھی محتاج نہ رہا صرف زبان ہلا کر ہی حریف کو گرا لیتا ہے خواہ وہ سحر حرام ہو یا سحر حلال۔

اس سے بھی اونچا وہ مانا گیا ہے جو روحانیت کی بے پناہ طاقت سے دشمنوں کی صفوں کو تہہ و بالا کر ڈالے اور اپنی ہمّتِ باطن سے دلوں کو لوَٹ دے جس سے دل مرعوب ہو جائیں اور مسلّح ہاتھ پاؤں شل ہو کر رہ جائیں۔ گویا یہ نہ سامان کا محتاج نہ بدن کا محتاج، نہ نفس کا محتاج، صرف روح کا کارکن نمائندہ

ٹھہرا۔ خواہ اس طاقت کا ظہور تلوار ہی کے راستہ سے ہو۔ مگر اس صورت میں تلوار محض حیلہ کے درجہ میں ہوتی ہے اصل کام اندرونی قوت کرتی ہے اور اس طرح یہ تمام وسائل ایسے شخص کے سامنے بے اثر اور حقیر بن کر رہ جاتے ہیں۔

اور جبکہ عام قلوب میں ہر اگلے درجہ والے مستغنی کی عظمت و عقیدت، سابقہ درجہ والے سے بڑھتی چلی جاتی ہے تو اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ عرفِ عام میں بھی طاقت کی حقیقت وسائل سے بے نیازی ہے، وسائل کی محتاجگی نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ پچھلے لوگ حسّی مادّوں کے بجائے زیادہ تر نفسانی اور معنوی قوتوں کی تسخیر کو کمال سمجھتے تھے اور ان کا مرکزِ توجہ زیادہ تر طلسمات، نجومیات، فلکیات، نفوسِ عناصر و افلاک اور خود نفسِ انسانی کی اندرونی طاقتیں رہیں، جنہیں شاق ترین ریاضتوں سے مسخر کیا جاتا اور اپنے نفس کو ان معنوی قوتوں سے قوی کر کے ظواہر سے بے نیاز بنا لیا جاتا۔ بعض نفوس عناصر کی تسخیر کر کے حقائق عناصر تک جا پہنچے۔ بعض نے نفوسِ فلکیہ اور ارواحِ سیارات سے کشش کیا اور عجائباتِ افلاک پر مطلع ہوئے۔ بعض نے ارواح سفلی و علوی سے جوڑ لگایا اور اپنے نفس میں خودی کی طاقت پیدا کی۔ بعض نے یہ دیکھ کر کہ ان تمام کائناتی طاقتوں سے کہیں زیادہ طاقتیں خود انسان کے نفس میں موجود ہیں، خود اپنی ہی اندرونی قوتوں، حواسِ خمسۂ ظاہرہ اور اس سے اوپر حواسِ خمسۂ باطنہ کی طاقتوں کو ریاضتِ نفس کے ذریعہ ایک مرکز پر سمیٹا، مسخر کیا اور ان سے بلا وسائلِ ظاہری کام لیا۔

غرض ان سب غیر محسوس شعبوں میں تسخیر معنویات کر کے خود اپنی معنویت اس درجہ پر لے آتے تھے کہ وسائل کی محتاجگی باقی نہ رہے اور یہ نفس جہاں بھی ہو باکمال ہو۔ یہ نہ ہو کہ آلات و وسائل کے جہاں میں تو نفس باکمال ہو اور اس سے الگ ہو کر بے ہنر ہو جائے۔ یہ بے نیازی اگر عین خلافت نہ تھی تو کم از کم شبہِ خلافت ضرور تھی۔

اسلام نے ان تمام طاقتوں کو مخلوقاتی طاقتیں بتلاتے ہوئے انسان کو خدا کی لطیف اور لامحدود طاقتوں سے مستفید ہونے کی طرف متوجہ کیا اور ارضیات، فلکیات، نفسیات یعنی تمام سفلیات و علویات سے گزار کر الٰہیات کی لامحدود وسعتوں میں پہنچا دیا جو تمام روحانی اور مادی طاقتوں کا سرچشمہ ہیں، مگر اس طاقت سے استفادہ کا راستہ اتباعِ انبیاء بتلایا کیونکہ یہ کوئی کرتبی راستہ نہ تھا کہ فنی طور پر اسے سیکھ کر مشق بہم پہنچائی جائے اور اس کے شعبدے اور کرتب دکھائے جائیں۔ بلکہ ایک ارتقائی اور استکمالی راستہ تھا جس سے سعادت انسانی کی تکمیل پیشِ نظر تھی۔ جو تخلیقِ انسانی کی اصلی غرض و غایت اور نمائندگیٔ الٰہی کی حقیقی روح ہے تاکہ اس الٰہی طاقت سے استفادہ کر کے انسانی طاقت علماً و عملاً حدِ کمال پر پہنچ جائے اور نتیجتہً انسان کا استغناء اور وسائلِ ظاہری سے اس کی بے نیازی بھی حدِ کمال پر آ جائے اور اس طرح اس میں خلافتِ الٰہی اپنی حقیقت کے ساتھ جلوہ گر ہو۔

لیکن آج کی مادہ پرست قوموں کی تمام تر کاوش حسی مادوں کی تسخیر اور ان کی حسی خاصیتوں کو آلات کے ذریعہ ابھار ابھار کر چند مادی منافع کے حصول

میں محدود ہوچکی ہے، اُن کی طرف سے روحانیت اور معنویت رہے یا جائے سب برابر ہے۔ وہ مشینری و آلات کے ذریعہ مادّوں کے جگر میں گھس کر فناء فی المادہ ہوچکی ہیں۔ گویا سائنس کی راہوں سے انسان اپنی معنوی قوتوں کا ذخیرہ لوہے، لکڑی اور پیتل کو سونپ کر خود کورا ہو بیٹھا ہے۔ اگر یہ سامان فراہم ہے تو وہ باکمال ہے ورنہ بے کمال۔ پہلی صورت میں انسان باکمال بنتا تھا اور اس دوسری صورت میں انسان کو آلۂ کار بنا کر لوہا، لکڑی اور برق وبخار وغیرہ اپنا کمال ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ ان اسباب کے نہ ہونے کی صورت میں انسان بے ہنر اور عاجز بن جاتا ہے، یہ انسانیت کی انتہائی پستی ہے کہ اُس نے اپنی جوہری طاقتیں کلیتہً لوہے اور پیتل کے سپرد کر دیں اور خود اُن کا دریوزہ گر بن گیا اور پہلے لوگوں کا یہ اعلےٰ ترین عروج تھا کہ وہ اس لوہے پیتل کی طاقتیں اُن سے چھین کر خود اپنے نفس کو قوی، مضبوط اور باکمال بنا لیتے اور ان اشیاء کو صرف ایک حیلہ کی حیثیت سے اختیار کئے رہتے تھے، نظر اُن کی مسبّبُ الاسباب پر ہوتی تھی۔ اسی لئے جن میں یہ غناء حدِ کمال کو پہنچ جاتا تھا وہ عملاً بھی ان وسائل کے بغیر اپنے کمال کا اظہار کر سکتے تھے۔

پس آج کا انسان الٰہیات اور فلکیات کی تو کیا عنصریات کی ارواح ونفوس حتیٰ کہ خود اپنی نفسیات کو بھی اپنے اندر جذب نہ کر سکا۔ وہ آکر گرا تو جسمانیات اور وہ بھی فلکی نہیں سفلی، اور سفلیات میں بھی محض مادیات اور حسّیات، اور وہ بھی بمحتاجگیٔ آلات ووسائل میں آکر گرا جس سے اُس کی دریوزہ گری اور محتاجگی یا پاجگی اور زیادہ بڑھ گئی اور وہ شرفِ انسانیت جو غناء وبے نیازی

سے پیدا ہوتا خاک میں مل گیا، جو بلاشبہ انسانیت کی حد سے گزری ہوئی پستی اور درماندگی ہے۔ مگر طرّہ اُس پر یہ ہے کہ اس ذلّت وپستی پر ربّ العزت کی خلافت کا دعویٰ اتنا کہ زمین وآسمان ایک کر دیا گیا ہے۔ پس جا تو رہی ہے انسانیت حضیضِ ذلّت کی طرف اور بر خود غلط زعم کیا جا رہا ہے اُس کے اوجِ رفعت پر پہنچ جانے کا اور نہ صرف رفعت وعزت ہی کا بلکہ اللہ کے واحد نمائندہ اور خلیفہ بن جانے کا و قال اللہ لا ینالُ عَھدِی الظّٰلِمِین۔

پس اگر خلافتِ الٰہی سے اشبہ اور اقرب کچھ طرزِ عمل تھا تو اُن پچھلوں کا تو تھا، جو معنوی اور نفسانی کمال پیدا کر کے طلسمات وغیرہ کی صورت میں نفس کو ظواہر سے بے نیاز کر لیتے تھے۔ گو اُن میں بعض مبطل تھے اور بعض محق یعنی روحانیت والے کمالِ استغناء پیدا کر کے حقیقی خلافت کے مقام پر آجاتے تھے اور یہ انفس یا آفاق کی مخفی طاقتوں کے تسخیر کنندے خلافت کی شبیہ اختیار کر کے خلفاء کے مشابہ بن جاتے تھے۔ لیکن آج کے مادہ پرست طبقے خالص حسّیات کے خُوگر بن کر اور مادّیات کے محتاجِ محض ہو کر نہ صرف خلافت اور شبہِ خلافت ہی سے بعید ہیں بلکہ خلافت کی صورت وحقیقت دونوں ہی کے لئے مخرّب ثابت ہو رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے یہاں خلافت کی اوّلین خشت غناء واستغناء ہی ندارد ہے تا بعمارتِ خلافت چہ رسد؟

اس کا یہ مطلب نہیں کہ احوال یا استغنائے وسائل پر اعتقاد کے بغیر ان مادّی اسباب کے طبعی خواص وآثار ظاہر ہی نہ ہوں گے بلکہ یہ ہے کہ خلافت کا تحقق نہ ہوگا۔ آج اور آج سے پہلے دُنیا کی بہت سی مادّہ پرست اقوام سے اِن

اعتقادات واحوال کے بغیر بھی مافوق العادت صناعیوں اور مادّی اختراعات کا ظہور ہوا اور آج بھی بہت سی مادّی قومیں ان وسائل سے بلا اعتقادِ تاثیر الٰہی تمدّن کے حیرتناک کرشمے دکھلا رہی ہیں جس سے سطحی طور پر اُن کے خلفائے الٰہی اور ایجاد واختراع میں نائبِ خداوندی ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے لیکن یہ خلافت نہیں صورتِ خلافت کی ایک ظلمانی پرچھائیں ہے جس میں نہ صرف یہ کہ خلافت کی رُوح (غناء وتوکّل) موجود نہیں بلکہ اُس کی ضِد موجود ہے۔

پس طبعی خواص وآثار کا تحقق یہاں ضرور موجود ہے۔ مگر منصبِ خلافت اُس کے آس پاس بھی نہیں صرف استدراجاً یہ مادّی کرشمے اُن کے ہاتھوں نمایاں کئے جا رہے ہیں نہ کہ کسی مقبولیت کی بناء پر جو رُوحِ خلافت ہے۔ پس جیسے کھانے پینے میں ذائقہ نیت پر موقوف نہیں مگر اجر وثواب نیت پر موقوف ہے، ایسے ہی مادیات کے طبعی آثار وخواص کا ظہور غنائے اسباب کے عقیدے یا حال پر موقوف نہیں لیکن خلافت کا منصب اور خدا کا مقبول نائب ہونا بلا شُبہ اس غناء وتوکل کی شان پر معلّق ہے۔

پس جو قومیں رات دن لوہے، لکڑی، اینٹ، پتھر اور عام مادی وسائل کی محتاجگی اور غلامی میں نہ صرف بسر ہی کر رہی ہیں بلکہ ان مادّیات کی بندشوں نے اُن کے خیال تک کو اپنا اسیر اور قیدی بنا لیا ہے جس سے وہ رُوحانیت سے بیگانہ اور منقطع ہیں، نہ وہ غناء وتوکّل سے عقیدتاً سرفراز ہیں نہ حالاً، تو انہیں خلافتِ الٰہی سے کیا تعلق، کیونکہ خلافتِ الٰہی کی توخشتِ اوّل ہی ان وسائل سے غناء ہے حالاً ہو یا اعتقاداً۔ خلیفۂ الٰہی ہتھوڑہ وآرہ اور بسولہ وبہان سے نہیں

بن سکتا۔ بلکہ علم واخلاق اور صنعت کاری میں غناء وتوکّل کے درجات طے کرنے سے ہوتا ہے۔ اگر علم "بے کتاب وبے معید واوستا" کا مصداق بن کر علمِ لدُنّی بن جائے۔ اخلاق تخلّق باخلاق اللہ کا مصداق ہو کر خلقِ حسن ہو جائیں اور قول "گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود" کا مصداق ہو کر القاء والہام اور فراست بن جائے اور فعل "وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ" کا مصداق بن کر فعل صدق ہو جائے، گویا اُس کا کہا ہُوا اور کیا ہُوا اُس کا نہ ہو بلکہ اُس کے خدا کا کہا ہُوا اور کیا ہُوا ہو اور وہ حقیقی معنی میں قولاً وفعلاً نمائندۂ حق ہو جائے تو خلافت کامل ہو گی ورنہ حسبِ نقصِ درجات ناقص رہ جائے گی۔ اب جن اقوام میں خلافت کی یہ بنیاد ہی ندارد ہو، نہ عقیدتاً موجود ہو نہ حالاً تو اُن پر منصبِ خلافت کو چسپاں کر کے انہیں خلفائے الٰہی یا عملی مومن کہنا اور اُن کے مقابلہ میں مسلم اقوام کو جو کم از کم عقیدتاً ان مادّی اسباب کو باوجود استعمال کرنے کے کوئی اہمیت نہیں دیتیں بلکہ صرف مسبب الاسباب ہی کو مؤثرِ حقیقی مانتی ہیں۔ عملی کافر اور لفظی مومن کہنا کہاں کا انصاف اور حق پسندی ہے اگرچہ وہ محکوم ہی کیوں نہ ہوں

وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ۔ "اور یقیناً مومن بندہ بہتر ہے مشرک سے اگرچہ یہ تم کو اچھا نہ معلوم ہو"

مگر یہ غنائے حقیقی جو اِن تینوں خلافتوں علمی، اخلاقی اور صنعتی وافعالی کی روح ہے اُسی وقت نصیب ہو سکتا ہے جب اللہ کے علمی قرآن یعنی کتاب اللہ سے تو علم حاصل کیا جائے اور اُس کے استدلالی اور بُرہانی قرآن یعنی کائناتُ اللہ کی محسوس مثالوں سے اُس کی معنویات کو سمجھا جائے اور اُس کے اخلاقی اور تعمیلی

قرآن یعنی رسول اللہ کے اُسوۂ حسنہ سے عمل بالقرآن کا ڈھنگ سیکھا جائے اور علمی دستورِ زندگی بنا کر زندگی کے ہر ہر گوشہ میں جذبۂ اتباعِ سُنّت کے ساتھ اُس کی پیروی کی جائے۔

پس کتابی قرآن حق کا راستہ دکھائے گا، کائناتی قرآن اس راستہ کو فہم کی گہرائیوں میں اُتار دے گا اور اللہ کا عملی قرآن یعنی رسولِ برحق اپنے عملی اُسووں سے اُس پر عمل کرائے گا جس سے نفس میں ملکاتِ خلافت راسخ ہوں گے اور ظاہر ہے کہ جب علمِ کتاب اور دلائلِ علمِ کتاب سے مقصود اثباتِ مدّعا ہے اور مدّعا سے مقصود اُس پر عمل پیرائی ہے اور عمل کا نمونہ رسول کی ذات ہے تو تینوں قرآنوں کا حقیقی مقصد اُسوۂ رسول پر چلنا نکل آتا ہے جس سے صاف واضح ہے کہ اس علمی قرآن کا عملی پہلو یہ کائنات نہیں کیونکہ وہ تو صرف تمثیلی اور بُرہانی قرآن ہے بلکہ عملی قرآن ذاتِ محمدیؐ ہے جس نے قرآنی ہدایات کو براہِ راست صاحب قرآن (حق تعالیٰ) سے سمجھ کر اُس پر عمل کرنا سیکھا اور اُسے کر کے دکھایا اور ہر ہر ہدایت قرآنی کا عملی خاکہ اور نمونہ اُمّت کے سامنے پیش کر دیا۔ اس لئے اس عملی قرآن کے نقشِ قدم کی پیروی ہی فی الحقیقت قرآنی ترقی، ایمانداری اور خلافتِ الٰہی ہو گی۔

پس قرآن کا اصل مقصود اتباعِ سُنّت اور اقتدائے اُسوۂ حسنہ نکل آتا ہے جس کے لئے یہ ساری کائنات ایک وسیلۂ محض رہ جاتی ہے۔ نہ یہ کہ اس عملی قرآن (ذاتِ نبویؐ) کے نمونۂ عمل سے تو قطعِ نظر کر لی جائے اور علمی قرآن (یعنی کتاب اللہ) کی محض تعبیرات کو لے کر اپنے مقاصد کی بلاغت بیانی کا آلہ کار بنا لیا جائے کہ تعبیرات قرآن کی ہوں اور ذہنی منصوبے اپنے ہوں جن کو اُس کی بلاغت بیانی

کے پردوں میں چھپا کر پیش کر دیا جائے اور اس اسلوب پر قرآنی مقصد مادّہ کی توڑ پھوڑ اور مادّی تصرفات ٹھہرا کر اس کا نام عمل بالقرآن رکھ لیا جائے۔ اگر یہی عمل بالقرآن ہے تو اس سے زیادہ گھاٹے کا سودا دُوسرا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ اس مادّی صنعت گری کو قرآنی عمل کہہ کر جب صرف مادّہ کی توڑ پھوڑ ہی میں عمرِ عزیز گنوا دی جائے گی تو یہ مادّہ اور مادّی لذّات تو یوں نہ رہیں گی کہ وہ ختمِ عمر پر ختم ہو جائیں گی اور اُخروی لذّات یوں نہ ہوں گی کہ اُنہیں مقصود بنا کر دُنیا میں اُن کی تحصیل و تکمیل کا ارادہ ہی نہیں کیا گیا تھا تو یہ صحیح معنی میں خسر الدّنیا والآخرۃ کا مصداق ہو جائے گا۔ جس کا خلاصہ دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ یہ توڑ پھوڑ کنندہ بندۂ سائنس یا عبد الاسباب خلیفۂ الٰہی تو یوں نہ بنا کہ بندگیٔ اسباب کے ساتھ یہ مادّی تصرفات بلا روحانیت اور بلا غنائے نفس خلافت نہیں، خلافت کا لاشہ ہیں جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور آخرت میں خلیفہ یوں نہ ثابت ہُوا کہ بنائے خلافت یعنی مستغنیانہ علم، غنیّانہ اخلاق اور بے نیازانہ کسب و عمل کو اُس نے مقصدِ قرآن ہی نہیں سمجھا کہ اُسے اختیار کرتا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ یہ نفسِ ناکارہ علم و معرفتِ الٰہی سے کورا رہ کر جہانِ مابعد میں اس طرح پہنچے گا کہ نہ تو وہ اللہ ہی کا خلیفہ اور نمائندہ ہو، کیونکہ مادّی وسائل سے بے نیازی اُس میں قائم ہی نہیں ہوئی تھی اور نہ وہ اپنا ہی نمائندہ ہو گا کیونکہ وہاں اس کورے اور عاری نفس کی وہ خودی اور خودداری قائم نہ رہے گی جو دُنیا میں ان فانی وسائل برق و بخار، انجن، مشین اور لوہے لکڑی کے بل بوتے پر قائم تھی تو صحیح معنی میں یہ نفس خسرانِ دُنیا اور حرمانِ آخرت کا مورد ہو کر رہ جائے گا، اور اس طرح

یہ نام نہاد خلافت، خلافت نہیں حماقت ثابت ہوگی۔ اگر معاذاللہ عمل بالقرآن کا نتیجہ یہی حرمان وخسرانِ دارین ہے تو قرآن کو دُنیا میں آنے اور اچھی خاصی مخلوق کو جو قیصر وکسریٰ کے زیرِ سرپرستی خلیفۂ الٰہی بنی ہوئی تھی، دارین کے حرمان وخسران میں مبتلا کرنے کی آخر کیا ضرورت پیش آئی تھی؟

رہا نفسِ صنعت وحرفت اور مادی تصرفات کا سوال، سو نہ قرآن اس کا مخالف ہے نہ دین نے اُس سے ممانعت کی ہے اور نہ کوئی عقلمند اس کے خلاف آواز اُٹھا سکتا ہے۔ دُنیا میں رہ کر دُنیوی ضروریات سے روک دیا جانا عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے۔ مگر ؎

کارِ دُنیا کن واندیشۂ عقبیٰ مگذار   تا بعقبیٰ نرسی دامنِ دُنیا مگذار

یعنی یہ ضرور ہے کہ یہ صنائع اور مکاسب اصولِ قرآنی کی رُو سے دارین میں کار آمد اور موجبِ فلاح جب ہی ہو سکتے ہیں جبکہ وہ خود مقصود نہ ہوں بلکہ کسی اُونچے نصب العین کے وسیلہ کی حیثیت سے استعمال میں آئیں جن میں نہ غلو ہو اور نہ مبالغہ اور نہ اُن کے ساتھ مقاصد کا سا غیر معمولی شغف اور دلچسپی ہو اور ظاہر ہے کہ یہ اونچا نصب العین وہی خلافت ہے جس کا حاصل اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور جس کا طریقہ خدائی علم سے آراستہ ہونا، خدائی اخلاق سے متخلق ہونا اور خدائی رنگِ صنعت گری سے رنگین ہونا ہے اور ان سب کی بنیاد وہی غناءٌ عن الوسائل ہے نہ کہ عشقِ وسائل۔ اس لئے یہ مادی وسائل اور مادی تصرفات خود خلافت نہیں بلکہ خلافت کے ادنیٰ ترین وسائل ثابت ہوتے ہیں اور کسی طرح جائز نہیں ٹھہرتا کہ اُنہیں مقصودِ اصلی سمجھنے یا اُن کے ساتھ مقصود کا سا برتاؤ

کرنے اور اُن میں ڈوب جانے کو عین ایمانداری یا خلافتِ خداوندی اور ایمان و تقویٰ پکارا جانے لگا۔ کیونکہ ایسا کرنا دین کا حُلیہ بگاڑنا اور اُسے اُدھیڑ کر از خود بُننا اور وہ بھی سونے کے تار کے بجائے زنگ آلود سیاہ لوہے کے تار سے بُننا ہے جو نہ خوشنما ہے نہ بقا پذیر ہے اور نہ مقبول ہے۔

اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ دین، صنعت وحرفت اور تسخیرِ عالم میں کمال حاصل کرنے یا اُس پر قابو پالینے کا تو مخالف نہیں مگر اُس کے نزدیک عام طبعی ضروریاتِ زندگی کے معمولی کسب واکتساب کو چھوڑ کر ایجاد واختراع اور تسخیرِ کائنات کا مطلوب طریقہ مادی تصرف نہیں بلکہ روحانی تصرف ہے۔ عالَم کو مادی قوت سے زیر کرنا نہیں بلکہ روحانی قوت سے قابو میں لانا ہے جو اسباب و وسائلِ مادیہ سے بے نیاز طریقہ ہے۔ ظاہر ہے کہ روحانی تصرفات کا راستہ عقل واستدلال سے طے نہیں ہوتا بلکہ عشقِ الٰہی اور اتباعِ نبویؐ کے شغف سے طے ہوتا ہے اور یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ مادی اسباب میں غلو اور مبالغہ سے طبیعت کو روکنے کی خُو پیدا کر لی جائے۔ یہ راستہ مضبوط بھی ہے اور دوامی بھی ہے جو دُنیا سے لے کر آخرت تک قائم رہتا ہے اور اُس پر مسافت ہر وقت اور ہر عالَم میں ممکن رہتی ہے۔ گویا آخرت بھی بنتی ہے اور دُنیا بھی ہاتھ سے نہیں جاتی۔ بخلاف مادیتِ محضہ اور وسائلی تصرفات کے، کہ یہ راستہ جوہری راستہ بھی نہیں جو صرف انسان کی اندرونی طاقت سے طے ہو اور بلحاظ نتیجہ یقینی اور قطعی بھی نہیں کہ اُس پر ثمرات کا مرتب ہونا لازمی ہو۔ پھر ہر ایک کے لئے عام بھی نہیں کہ سب کو یہ وسائل میسر ہی آجائیں اور ساتھ ہی پائیدار بھی نہیں کیونکہ آخرت کی پہلی ہی منزل پر یہ

تمام وسائل اور تصرفات بے کار ثابت ہوتے ہیں جس سے دُنیا تو ختم ہو جاتی ہے اور آخرت بنتی نہیں ۔

پس پہلا راستہ تو فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً کا مصداق ہے اور دوسرا راستہ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ کا مصداق ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اسلام صنعت گری کی قوت پیدا کرنے اور اُسے ظہور میں لانے کا مخالف نہیں بلکہ داعی ہے مگر اپنے ہی راستہ سے۔ وہ چاہتا ہے کہ خلیفۂ الٰہی حقائق کائنات پر مطلع ہو اور اُن کا گہرا مطالعہ بھی کرے مگر محض پیشانی کی نہیں، بلکہ پیش آنی کی آنکھ سے، وہ ان میں تصرفات بھی کرے مگر خارجی وسائل کا محتاج ہو کر نہیں بلکہ خود اپنی اندرونی طاقت کے بل بوتہ پر۔ پس خارجی وسائل کی محتاجگی سے مادہ کی توڑ پھوڑ خلافت نہیں بلکہ خلافت کی ظلماتی پرچھائیں ہے جو ہمیشہ اصل کے خلاف چلتی ہے۔

لیکن پھر بھی جو لوگ اس واقعی حقیقت کے برخلاف کائنات میں محض مادی تصرفات اور مادی توڑ پھوڑ میں مبالغہ اور غُلو ہی کو سب کچھ جانتے ہیں اور اسی کو ایمانداری اور خلافتِ کبریٰ سمجھ رہے ہیں اُن کی غلطی کا منشاء وہی صحیفۂ کائنات کو قرآن کا عملی پہلو سمجھ کر اُسے عملی قرآن کا لقب دیدینا اور اسی سے عملی نمونے اخذ کرنا ہے۔ درآنحالیکہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ صحیفۂ کائنات عملی قرآن نہیں جس سے عمل کے نمونے لئے جائیں بلکہ صرف تمثیلی اور بُرہانی قرآن ہے جس سے نظریاتِ قرآنی کے اثبات کے لئے دلائلِ نظر و فکر کے نمونے لے کر نظر کو مصنوع سے صانع تک پہنچانا ہے، وہ خود انسان کے لئے عمل نہیں کہ اُس کے مادّوں کی توڑ پھوڑ کو مقصدِ حیات سمجھ کر رات دن اُسی کے جوڑ توڑ سے اُسی کی مادی گہرائیوں میں غرق ہو جانا اور

دُخان و بخار اور برق و غاز وغیرہ کے نئے نئے نمونوں کو قابو میں لا کر دُنیا پر اُنہیں آزمانا ہے جس کا نتیجہ خود کو اور ساری دُنیا کو برباد کرتے رہنا ہے ۔

پس عملی قرآن جن سے قرآن کے تقاضا کردہ عملی نمونے اور اُسوے اخذ کئے جائیں، کائنات نہیں بلکہ پیغمبر کی ذات ہے۔ کائنات دعاویٔ قرآنی کے لئے صرف حسّی دلائل کا مجموعہ ہے نہ کہ اُن دعاوی کا تقاضا کردہ عمل۔ پس اُسوہ اور نمونہ صرف اُسی ذاتِ بابرکات سے حاصل کیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ ذاتِ نبویؐ کے اس اُسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل کی روح مادّی شغف نہیں بلکہ وہی علم الٰہی، غنائے کامل، وسائلِ مادّی سے بے نیازی اور اُن پر روحانی تسخیر و تصرف سے قابو پانا ہے جو آپ کے ہر شعبۂ زندگی سے نمایاں ہے۔ پس آپ کے یہاں اسبابِ معاش کی فراہمی ضرور ہے مگر اجمالِ طلب اور توکل کے ساتھ۔ جہاد میں ہتھیار ضرور ہاتھ میں ہے مگر ہتھیار کی قوت سے زیادہ قوتِ یقین اور انابت الی اللہ کی طاقت آگے آگے ہے۔ نظمِ ملت کا سامان بھی ہے مگر ان تشکیلات اور وسائلِ عامّہ کے راستہ سے نہیں بلکہ ایمان باللہ اور عملِ صالح کے راستہ سے ۔

ظاہر ہے کہ اس فرق کے بعد "دو قرآن" کا نظریہ باقی نہیں رہتا بلکہ جیسا کہ سابق میں عرض کیا جا چکا ہے اگر نظریہ بنتا ہے تو "تین قرآن" کا بنتا ہے کہ ایک اللہ کا علمی قرآن ہے جو اوراق میں مرقوم ہے یعنی کتاب اللہ۔ ایک اُس کا بُرہانی اور تمثیلی قرآن ہے جو اوراقِ عناصر و موالید میں مکتوم ہے یعنی کائنات اللہ (جسے غلطی سے عملی قرآن باور کرا دیا گیا ہے) اور ایک اللہ کا عملی قرآن ہے جو ذاتِ محمدی میں معصوم ہے یعنی رسول اللہ۔ (جسے کلّیتہً نظر انداز کر دیا گیا ہے) نظریہ کے

بدل جانے سے قدرتاً مسائل کا رُخ بھی بدل گیا۔ یعنی عملی قرآن ذاتِ ثابت ہو جانے کے بعد اب یہ مسائل قائم نہیں رہ سکتے کہ قرآن کی رُو سے مسلمان کی اصلی ترقی کا میدان ہواؤں میں اُڑنا، بادلوں میں گھس جانا، زمینی مسافتیں برق باد سے لمحوں میں طے کر لینا، لاسلکی سے مشرق و مغرب کی خبروں کو ایک کر دینا۔ ایکسرے وغیرہ سے بدن کے چھپے ہوئے امراض کا سراغ لگا لینا، دل کی دھڑکنوں کے اسباب و علل پر بذریعہ آلات مطلع ہو جانا اور رحمِ مادر کے مکنونات کو باہر لے آنا یا پھر ان اسباب کی مفرطانہ تجارت سے رسمی جاہ و جلال اور کرّ و فر پیدا کر لینا یا اُن میں کے مہلک آلات سے دُنیا پر استبداد اور اقوامِ دُنیا پر استعباد (غلام سازی) مسلّط کر دینا وغیرہ وغیرہ ہے بلکہ اب ہم انسانی ترقی کو صحیفۂ کائنات میں ڈھونڈنے کے بجائے ذاتِ نبویؐ کے اُسووں میں تلاش کریں گے تو وہاں اس نمائشی خلافت یا تخریبی خلافت کے نمونوں کے بجائے تعمیری خلافت اور عمل بالقرآن کے نمونے ملیں گے، جن کی علم الٰہی، معرفتِ ذات و صفات، عظمتِ شرائع، اخلاقِ ربّانی، غناء و ایثار، خدمتِ خلق اللہ اور تخلّق الٰہی کو مادیات کے دلدل سے نکال کر روحانیت کے میدان میں پہنچانا اور نفسانی عیش سے روحانی لذات کی طرف منتقل کرنا نمایاں ہو گا۔ وہاں فضاء میں اُڑنے کے بجائے روحانی فضاؤں میں عروج کرنا، مشرق و مغرب کو ایک کر دینے کے بجائے آلہیاتی علوم سے عرش و فرش کو ایک کر دینا اور فرشِ زمین کو عرشِ بریں کی الٰہی خبروں سے منوّر بنا دینا، بدن کے امراض کے بجائے قلوب و نفوس کے چھپے ہوئے مکائد اور روگ کھول دینا، جن کی اصلاح سے بدن بھی صالح بن

جائے۔ دل کی حسّی دھڑکنوں پر مطلع ہونے کے بجائے لطیفۂ قلب کی کھٹک اور پراگندگیوں پر مطلع ہو کر سکونِ قلب کا سامان مہیا کرنا جس سے یہ صنوبری مضغۂ گوشت بھی ساکن ہو جائے۔ رحمِ مادر کے مکنونات کھولنے کے بجائے ارواح و انفس کے مخفی اسرار کھولنا، نمائشی کرّ و فر کے بجائے تواضع للّٰہ، فروتنی اور مساوات کے جذبات اُبھارنا، مہلک آلات سے مخلوقِ خدا کو بے دردانہ انداز سے تباہ کرنے کے بجائے رحمتِ عامّہ اور عالمی امن و سکون کے دروازے کھول دینا اور عالمگیر اخلاقِ کاملہ سے دیانت و امانت، محبت و ہمدردی، ایثار و احسان کے جذبات پیدا کر دینا، معاصی کو رسمی انداز سے روکنے سے زیادہ دلوں میں معاصی سے نفرت بٹھلا دینا اور انفس میں نفس و شیطان کی حکومت کے بجائے عقل و شرع کی حکومت قائم کر دینا وغیرہ واضح ہو گا جو حقیقتاً خلافتِ الٰہی کا تقاضا کردہ عمل اور اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کا سچا مصداق ہے جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ دُنیا کو سنوارنے کا طریقہ اچھی چیزیں بنانا نہیں بلکہ اچھے آدمی تیار کرنا ہے۔ خلافت کے معنی فیکٹریاں قائم کر کے بازاروں کو تجارتی سامانوں سے بھر دینا نہیں بلکہ دل و دماغ کی زنگ آلود فیکٹریوں کو صاف کر کے اُن پر پاکیزہ افکار، پاکیزہ عقائد اور پارسائی کے اعمال ڈھال کر نکالنا ہے جس سے انسانیت نشو و نما پائے اور بہیمیت اور درندگی کو فروغ پانے کا موقع نہ ملے۔

اس فرق کے بعد عَالَم کے ہیرو اور خلفائے الٰہی ملحدانِ یورپ یا ملحدانِ ماضی، فرعون، ہامان، نمرود اور شدّاد یا قیصر و کسریٰ ثابت نہ ہوں گے، جنہوں نے مادی سائنس کے شاہکاروں سے دُنیا کو معمور کیا بلکہ اس اُسوۂ محمدیؐ کی روشنی میں

صدیقؓ و فاروقؓ، علیؓ و عثمانؓ، خالدؓ و ابو عبیدہؓ اور اوپر چل کر حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ حضرت نوحؑ و ابراہیمؑ اور تمام انبیائے سابقین اور تمام صلحائے عالم ثابت ہوں گے جنہوں نے صفحاتِ کائنات کا گہرا مطالعہ کر کے ان مادی شاہکاروں کو مٹانے میں اپنی پوری قوت صرف فرمائی۔ روحانیتوں کو اُجاگر کر کے مادیت کو سرنگوں کیا اور مادی وسائل کی محتاجگی سے مخلوق کو نکال کر روحانیت کی آزاد فضا میں پہنچایا۔ تا آنکہ مادی زندگی کے سکون ولذت سے بھی محروم نہ رہے اور روحانی زندگی تو اُن ہی کا حقیقی حصّہ تھی۔

رہا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگوں میں وہی مادی وسائل لاتے تھے جو دشمن لے کر آتا تھا، سو یہ نہ کوئی عقلی نظریہ ہے نہ تاریخی، کبھی تشدد کا مقابلہ عدم تشدد سے ہوتا ہے جیسے مکّہ کی زندگی میں ہُوا۔ اور آج بہت سی اقوام نے اس اصول پر طاقت ور دُشمن سے نجات حاصل کر لی اور حرب و ضرب کا مقابلہ صبر اور مقاومت مجہول سے کیا اور فتح پالی۔ جس سے واضح ہے کہ اسلحہ کے مقابلہ میں کبھی اخلاقی قوت اسلحہ سے بھی زیادہ کام دیتی ہے۔ اس سے بھی اُوپر کا مقام روحانی قوت ہے یعنی تعلّق مع اللہ، اور رابطۂ عبد و معبود جو ہر قوت سے بڑھ کر ہے۔ اگر اسلحہ اور سامانِ جنگ کی قلّت کے ساتھ روحانیت، قوتِ یقین، توکل، صبر و استقامت اور موتِ شہادت کی محبّت کا جوش ہو اور انسان اللہ کا سپاہی بن کر میدان میں آجائے تو اُس کے سامنے بڑے بڑے سامانوں والی فوجیں نہیں ٹھہر سکتیں سلف کی جنگیں اسی عنوان کی تھیں۔ وہاں نہ اس کی پرواہ کی جاتی تھی کہ پہلے فوج کی تعداد دشمن کی فوج کے برابر کر لیں، نہ اس کی کہ سامان دُشمن کے جیسے

سامان کے برابر ہو جائے، نہ اس کی کہ پہلے مال و دولت کم از کم دشمن کے اموال کے مساوی ہو جائے۔ تعداد کے بارہ میں تو اُن کے سامنے ہدایتِ ربّانی تھی:۔

کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصَّابِرِينَ - اور اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ الخ

جس میں تعداد کی قلت کا تدارک صبر و استقامت سے نہ کیا گیا ہے نہ کہ تعداد برابر ہو جانے کے انتظار میں اصل مقصد سے روکا گیا ہے۔

مصارفِ جنگ کی قِلّت و کثرت کے بارے میں اُن کے پیشِ نظر صاحبِ شریعت کا یہ فرمان رہتا تھا:۔

اِنَّكُمْ لَنْ تَسَعُوْهُمْ بِاَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ تَسَعُوْهُمْ بِاَخْلَاقِكُمْ -	"تم دُنیا کی اقوام پر اپنے مال و دولت (یعنی وسائل مادی) سے غلبہ نہیں پا سکتے بلکہ اپنے اخلاق (یعنی وسائلِ روحانیہ) سے غالب آسکتے ہو"

سامانِ رسد کے بارے میں اُن کے پیشِ نظر یہ منظر تھا کہ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ احزاب میں خندق کھود رہے ہیں اور فاقوں کی کثرت سے بدن کو سہارا دینے کے لئے پیٹ سے پتھر بندھے ہوئے ہیں جبکہ دشمنوں کے پاس سامانِ رسد کی کوئی کمی نہ تھی۔

پس یہ نظریہ کہ حضورؐ جنگوں میں وہی سامان اور ویسے ہی اسلحہ لیکر تشریف لاتے تھے جیسے دشمنوں کے ہوتے تھے نہ عقلی ہے نہ تاریخی۔ ہر قوم اپنے مزاج کے مطابق سامان کرتی ہے۔ مسلم قوم کا اصلی مزاج سامانوں پر

توکل نہیں بلکہ اللہ پر بھروسہ اور اپنی عبدیت کے پیشِ نظر یا نفس کو فی الجملہ تسلّی دینے کے لئے کسی حد تک وسائل کا اختیار کر لینا ہے۔ یہی ان کی تاریخ ہے اور یہی اُن کا مزاج۔ دوسری اقوام کے مزاجوں کی رعایت میں غرق ہو جانے یا مرعوبیت کے ساتھ اقوام کی نقالی کرنے یا آج کی متمدّن اقوام کی مادی ترقی کو اُسوہ اور نمونہ بنا کر اُس کے معیار پر اپنے آپ کو جانچنے سے یہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم اپنے اصلی مزاج پر آ جائیں اور ان جدید رجحانات اور جدید تقاضوں کے پُورا کرنے کے زبان زد عنوانات کو ترک کر کے اپنے ہی اصلی رجحانات اور بُنیادی تقاضوں کو پُورا کرنے لگیں تو یہ ذہنی کشمکش ختم ہو جائے جس نے آج پریشانی میں ڈال رکھا ہے۔ مقصد سلف کا مذاق پیدا کرنا اور اُسی مذاق پر ظاہری سامان اور مادی وسائل کا مہیا کرنا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر صحیح نتائج پیدا ہونے کی صورت نہیں ہے۔

ان تصریحات کے بعد ہمارے نزدیک مادیات سے ملّا کی جہالت مضر نہیں رہتی البتہ روحانیات اور اسلامی مذاق سے مخالف ملّا کی جہالت مہلک ثابت ہوتی ہے، کیونکہ ملّا تو روحانیت کا عارف بن کر مادیت کے نشیب و فراز سے بھی نابلد نہیں رہتا۔ لیکن بے بصیرۃ مخالفِ ملّا سائنس کی ناتمام معلومات پر بھروسہ اور ناز کر کے حقائقِ الٰہیّہ سے یکسر غافل رہ جاتا ہے یعنی اطاعت کی راہ سے ملّا تو عارفِ اسرار ہو جاتا ہے اور استکبار کی راہ سے مخالفِ ملّا اپنا فطری سرمایہ بھی کھو بیٹھتا ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔ مگر مُلّا سے میری مراد کٹھ مُلّا اور بے بصیرت کٹھ حُجّت لوگ نہیں بلکہ وہ عارف و بالبصیرت مُلّا ہے جس کی نگاہوں

میں حقائقِ الٰہیّہ سمائی ہوئی ہوں اور اس لئے برق و بخار، گیس و دخان وغیرہ جیسی حقائقِ مادیہ اُسے لہو و لعب نظر آتی ہوں۔

اس سے میرا مقصد مسلمان کے حق میں سائنس اور فلسفہ کے میدان کو تنگ کرنا یا قوت و شوکت کے مادی وسائل سے کلیۃً محروم بنانا نہیں بلکہ اُن کی حدود بتلانا ہے کہ وہ وسائلِ محض ہیں مقاصد نہیں۔ تحفظِ خلافت کے وسائل میں سے ادنیٰ درجہ کے وسائل ہیں خود خلافت نہیں۔ نیز یہ کہ وہ خواہ کچھ بھی ہوں مگر قرآن کی آیاتِ تکوین کا جن کو اس سلسلہ میں بطور ماخذ کے پیش کیا گیا ہے، نہ مدلول ہیں نہ مصداق ہیں اور نہ کوئی تقاضا کردہ عمل ہیں۔ اُن کا ماخذ دوسری آیتیں ہیں جن میں اُن کی نوعیت اور حدود پر کافی و وافی روشنی ڈال دی گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کرنا ہے کہ یہ مادی سامان مسلمان کے لئے میدانِ ترقی ہی نہیں کہ اُن میں گھس جانا اُس کی مدح و ذم، یا ایمانداری و غیر ایمانداری، یا لفظی و معنوی کفر و اسلام کا معیار قرار پائے۔ مسلمان کے لئے معیارِ مدح و ذم صرف علم و اخلاق، تصرفِ روحانی اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ مادی تصرفات بقدرِ ضرورت رکھے گئے ہیں۔ فی نفسہٖ مقصود و معیار نہیں۔

اسی سے حریت و آقائی کا مفہوم بھی اسلامی حیثیت سے متعین ہو جاتا ہے کہ وہ صرف تلوار ہاتھ میں لے لینا نہیں بلکہ قانونِ حق کو نافذ العمل بنانا ہے پہلے اپنے اوپر، پھر ماحول اور اُس کے پس و پیش پر۔ اگر کسی قوم نے تلوار اٹھائے بغیر قرآن کو اپنے اور اپنے ماحول پر نافذ کر لیا تو وہ بلاشُبہ آقا ہے ورنہ قطعی طور پر غلام ہے خواہ نفس کی ہو یا غیر کی۔ پیغمبر معصومؑ اور صحابۂ کرامؓ مکّہ کی ۱۳ سالہ زندگی

میں بھی آقا تھے جبکہ تلوار ہاتھ میں نہ تھی اور مدینہ کی دس سالہ زندگی میں بھی ویسے ہی آقا تھے، جبکہ وسائلِ شوکت اُن کے ہاتھ میں تھے۔ کتنے ہی انبیاء علیہم السلام کو جہاد و سیاست سرے سے دیئے ہی نہیں گئے۔ لیکن اوامرِ الٰہیہ کی تنفیذ میں، خواہ وہ اخلاقی ہی رنگ میں ہو، دونوں کی آقائی اور عند اللہ مقبولیت و عظمت میں کسی کلام کی گنجائش نہیں، جس سے واضح ہے کہ آقائی کی حقیقت کوئی قدرِ مشترک ہے جو تلوار اور بے تلواری دونوں میں بدستور قائم رہتی ہے اور وہ صرف دیانت، انابت اور اشاعت ہے اور جس کا حاصل اللہ کی غلامی ہے کہ اُسی میں آقائی کا راز پنہاں ہے۔

یہی دونوں حالتیں اُمت پر بھی گزرنی تھیں، اُمت کے بعض طبقے مکہ کی زندگی میں آگئے جس کا حاصل محض پٹ لینا اور صبر کرنا نہیں بلکہ ماریں کھا کر اعلائے کلمۃ اللہ کرنا اور ترویجِ کلام اللہ کو برابر انجام دیئے جانا ہے جس کو قرآن نے جہادِ کبیر فرمایا ہے اور بعض مدینہ کی زندگی میں آگئے، جس کا حاصل قوت سے استیصالِ فتنہ کر کے اشاعتِ دین کی راہیں ہموار کرنا اور شعائر اللہ کو اُونچا بنانا ہے تاکہ دینِ حق ہمہ گیر اور غالب ہو جائے جس کو جہادِ صغیر کہا گیا ہے۔ دونوں زندگیوں کا قدرِ مشترک وہی تدین بدین اللہ، اعلائے کلمۃ اللہ، تبلیغ کلام اللہ اور تربیتِ خلق اللہ نکلتا ہے جو اصل مقصود ہے اور جو حقیقتًا ایمان کے کمال و نقصان، ہدایت و ضلالت، فجور و تقویٰ اور خلافت و عدمِ خلافت کا معیار ہے جس کی رُو سے مسلمانوں کو پرکھا جا سکتا ہے۔

پس وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ جیسی آیاتِ کریمہ کے نام پر تیر و تفنگ

جمع کر لینا یا تکوین کی آیات سے بے محل استنباط کر کے صنعتی، تجارتی اور عسکری کاروبار پھیلا لینا فی نفسہٖ خواہ کتنا ہی ضروری ہو مگر خود حریت و آقائی نہیں۔ آقائی قرآن کو نافذ العمل بنا دینا ہے جس کے لئے یہ اعدادِ مستطاع ایک وسیلہ اور ذریعہ سے زیادہ نہیں۔ جیسے وضو قرآن کی رُو سے فرض و واجب سہی مگر ہے بہرحال محض مفتاحِ صلوٰۃ، بلکہ وہ ضروری بھی اُسی کی وجہ سے ہے فی نفسہٖ نہیں۔

پس اگر ایک قوم نے شوکت حاصل کر لی لیکن اُس کی شوکت دین کے حدود و شعائر قائم کرنے سے غافل یا عاجز رہی تو اُسے حریت و آقائی کے دعویٰ یا تصور کا کوئی حق نہیں وہ بدستور غلام ہے۔ دوسروں کی ہو یا اپنے نفس کی اور بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ، زیادہ سے زیادہ دوسرے غلاموں اور اُس میں یہ فرق ہو گا کہ ایک بے تلوار کے غلام ہوں گے اور ایک با تلوار لیکن نفسِ غلامی میں کوئی فرق نہ ہو گا بلکہ تلوار سمیت غلامی زیادہ ننگ و عار ثابت ہو گی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم مسلمانوں کے تلوار بدست منطقوں کی بے حرمتی یا بے توقیری کے درپے ہیں، معاذ اللہ! ہم اُن کے ہر حالت میں دُعا گو ہیں۔ لیکن یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ اگر اُن کی یہ شوکت اعلائے کلمۃ اللہ سے ہمکنار نہیں بلکہ اور اُلٹا اعلائے کلمۃ الکفر یا کلمۃ الفسق سے ہم آغوش ہے تو وہ ابھی تک نہ صرف وسائلِ بے مقصد ہی کے جال ہی میں پھنسے ہوئے ہیں بلکہ خلافِ مقصد تگ و تاز کرنے سے اُن کی یہ شوکت بھی کوئی اسلامی شوکت نہیں، اگر ہے تو کسی حد تک محض قومی اور قوموں کے اشتراک کی وجہ سے خالص قومی بھی نہیں،

بلکہ ایک نمائشی شوکت ہے۔

پس اس قسم کے منطقے تا تحصیلِ مقصد، آقائی کے تصوّر میں غلط رَو اور دعوائے حُرّیت میں غلط گو ہیں۔ اسلام میں حُرّیت و آقائی تلوار کا نام نہیں، تنفیذِ عدلِ قرآن کا نام ہے، جب وہ نہیں تو یہ وسائل اُس کے وسائل بھی نہیں اور اس لئے ایسے منطقے نہ مقصود کے حامل ہوتے ہیں نہ وسائل کے بلکہ اُن کی نسبت تو شاید وہی لوگ کچھ غنیمت ثابت ہوں گے جو کم از کم اعلائے کلمۃ اللہ، ترویجِ کلام اللہ اور تربیتِ خلق اللہ کے مقصد کو علماً و عملاً سنبھالے ہوئے ہیں اور مابقاء کے لئے جذبۂ صادق سے قلوب کو خالی بھی نہیں پاتے۔

پس اگر مکہ کی صابرانہ زندگی تبلیغی جہاد کی وجہ سے مجاہدانہ، اور وہ بھی بجہادِ کبیر زندگی کہلائی جا سکتی ہے تو ایسے افراد کی زندگی اس دَورِ فتن میں کیوں اس پاک لقب کی مستحق نہیں ہو سکتی؟ ادھر جو لوگ تلوار بدست ہو کر بھی اپنی عملی زندگی سے ان حقیقی مقاصد کی تکمیل کا ثبوت نہیں دیتے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اُن کے مضمر نظریات صرف دُنیوی اقتدار اور جاہ و عیش تک محدود تھے، گو اُن کا زبانی دعویٰ کچھ بھی تھا۔ نیز ثابت ہو گا کہ وہ باقتدار تدیّن کو خلافت نہیں سمجھتے بلکہ صرف اقتدار ہی کو خلافت و ایمان سمجھے ہوئے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسا اقتدار جس میں مُلک اور دین توأم نہ ہوں بلکہ مُلک بلا دین ہو، وہ یقیناً خلافت نہیں ملوکیت ہے اور جبکہ وہ ملوکیت بھی تحفظِ دین و شعائرِ دین کا ذریعہ نہ بنے بلکہ اُس کے برعکس منافیٔ دین امور کے تحفّظ کا ذریعہ ہو تو وہ ملوکیتِ عادلہ بھی نہیں بلکہ مُلکِ عضوض ہے جسے کٹ کھنا مُلک کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صُورت میں یہ

شوکت افنائے گناہ کے بجائے اضافۂ گناہ کا ذریعہ ثابت ہو گی اور اس صورت میں اس گناہ و فاحشہ کی نسبت اُن ہی لوگوں کی طرف کی جائے گی جنہوں نے اضافۂ گناہ کے ان پُرشوکت وسائل کو بنامِ اسبابِ افنائے گناہ اختیار کر لیا ہے کیونکہ جب انہوں نے ملزوم کو مان لیا ہے تو لازم کا ماننا لامحالہ اُن کے ہی سر پڑے گا۔ خواہ اُن کا یہ ارادہ و نیّت بھی نہ ہو۔

رہی حکومت و سلطنت تو اسبابِ معاش، صنائع و حِرَف اور اسلحۂ جنگ کی طرح وہ بھی وسیلۂ قیامِ دین ہے، خود بذاتہٖ مقصود نہیں اور اگر خلافتِ مقصود کا ذریعہ ہو تو سخت مضر ہے۔ سلطنت کو مقصودِ اصلی باور کرانے اور محکوم مسلمانوں کو جو بدقسمتی سے کہیں دوسری اقوام کے غلام بن گئے ہوں، غیر صالح یا غیر مومن' یا لفظی مومن اور عملی کافر باور کرانے کے لئے عموماً یہ آیت پیش کی جاتی ہے:۔

اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ۔ "زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے"

جس کا حاصل یہ نکالا گیا ہے کہ صالح افراد جو اپنی محنت و ایثار، تسخیرِ کائنات تنظیم جدّوجُہد اور جفاکشی وغیرہ سے سلطنت کا استحقاق پیدا کر لیں گے، زمین کے حکمران ہوں گے۔ لہٰذا جو حکمراں ہیں وہ تو صالح ہیں خواہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں؟ اور جو حکمران نہیں ہیں وہ غیر صالح، لفظاً مومن اور عملاً کافر ہیں لیکن جبکہ یہ آیت اس بارے میں خاص نہیں تو اس سے کہیں کہ محکوم مسلمانوں کو ایمان کے بعد اسمائے فسوق سے یاد کیا جانا انتہائی جسارت اور قرآن کی تحریف ہے۔ کیونکہ:۔

(۱) اوّل تو ان الارض کو ارضِ دُنیا میں منحصر مان لینا ہی بے دلیل بلکہ خلافِ دلیل ہے۔ سلف میں سے بکثرت اس سے ارضِ جنّت مراد لے رہے ہیں

اور اسی کو اوفق بالقرآن کہہ رہے ہیں۔ چنانچہ سیاق و سباق کا تقاضا بھی یہی ہے،
ظاہر ہے کہ اس صورت میں صلاح کو تحصیلِ سلطنت کی جدّوجہد میں منحصر مان
لینا غلط ہوگا کیونکہ جنّت میں اُمّتِ مرحومہ اور اُمَمِ سابقہ کے وہ لاتعداد انسان
بھی جائیں گے جنہیں سلطنت نہیں ملی، بلکہ ان کی شریعت ہی میں سلطنت نہیں
رکھی گئی اور اُنہیں جہاد و سیاست کا سرے سے مکلّف ہی نہیں بنایا گیا۔ اندریں
صورت اس آیت سے محکوم مسلمانوں کو غیر صالح ٹھہرانا محض ایک جذباتی بات ہوگی۔

(**۲**) اور اگر ارض سے ارضِ دنیا ہی مراد ہو اور وراثتِ ارضی سے حکومت
و سلطنت، تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں ساری زمین مراد لینا بھی بے دلیل
ہوگا۔ جبکہ پورے روئے زمین پر مسلمانوں کی حکومت نہ آج ہے نہ قرن اولیٰ
سے آج تک ہوئی۔ ورنہ تیرہ صدی کے تمام مسلمان حتیٰ کہ قرونِ اولیٰ کے
بھی، معاذ اللہ، غیر صالح اور عملی کافر ٹھہر جائیں گے۔ محکوم مسلمان بوجہ غلامی کے
اور حکمران مسلمان بوجہ محدود السلطنت رہ جانے کے۔

(**۳**) اور اگر وراثتِ ارض سے کل ارض کی نہیں، بلکہ بعض ارض ہی کی
حکومت مراد ہو تو جس صورت میں کہ یہ بعض غیر معیّن ہے، اس حکومت کے تحقق
کے لئے کیف ما اتفق کسی خطّۂ زمین پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جانا
کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھی غیر آزاد خطّوں کے محکوم مسلمان
آیتِ بالا کی رُو سے عملی کافر یا غیر صالح نہیں ٹھہرتے۔ البتّہ اگر روئے زمین
کے کسی خطّہ پر بھی مسلمانوں کی حکومت نہ ہو تو اس صورت میں معنی مذکور
کی رُو سے سب گناہ گار ٹھہریں گے۔ سو یہ صورت نہ آج ہے نہ گذشتہ

تیرہ صدی میں اب تک ہوئی۔

(**۴**) اور اگر وراثتِ ارضی سے بعض معیّن خطّوں کی حکومت مُراد لی جائے
جیسا کہ مُلکِ شام اور فلسطین، چنانچہ بعض مفسّرینِ سلف نے الارض کے
الف لام کو لامِ عہد کہہ کر اس سے فلسطین ہی مراد لیا ہے، تو پھر یہ آیت ایک
مخصوص حکومت کی پیشین گوئی ٹھہرتی ہے۔ جو دورِ صحابہ میں صالحین کے ہاتھوں
پُوری ہوگئی۔ اب اس آیت کی رُو سے کسی کو یہ حق کب پہنچتا ہے کہ وہ بعد کے
مسلمانوں کو جو بدقسمتی سے کہیں محکوم بن گئے ہوں غیر صالح یا عملی کافر قرار دے۔
اس صورت میں اسلامی حکومت کی ضرورت کا ماخذ بھی یہ آیت نہ ہوگی، اگر ہوگی
تو یہ آیت ہو سکے گی :-

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۔

"زمین خدا کی ہے جسے چاہے اُس کا وارث اپنے بندوں میں سے بنا دے۔"

مگر اس میں وراثت کے ساتھ صالح کی قید نہیں۔ اس کی رُو سے صالح اور غیر صالح
دونوں حکمران بن سکتے ہیں۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ محکوم صالح بھی ہو سکتا ہے
اور غیر صالح بھی، پھر محکوم کو غیر صالح اور عملی کافر کہہ دینا کس طرح جائز ہوگا۔

(**۵**) لیکن اگر اس آیت کو بلا تخصیص ساری ہی زمین کی حکومت پر محمول کر
لیا جائے اور صرف وہی لوگ صالح کے لقب کے مستحق ہوں جو حکومت بنائیں
تب بھی اُس وقت یا کسی وقت کے بھی محکوم مسلمان یا محکوم اسلامی خطّے، غیر
صالح یا عملی کافر قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ کیونکہ اس آیت میں اُس ہفت اقلیم کی
سلطنت کے لئے مسلمانوں کو کوئی میعاد نہیں دی گئی ہے کہ اس کے اندر اندر

اگر وہ آل ورلڈ (عالمگیر) حکومت بنالیں گے تو وہ صالح رہیں گے ورنہ غیر صالح، اور عملاً غیر مومن ٹھہر جائیں گے، ورنہ سب سے پہلے تو یہ عدم صلاح کا الزام معاذ اللہ قرنِ اولیٰ ہی کے سر پڑ جائے گا۔ تا بقرونِ مابعد چہ رسد ؟

ہاں اگر صلاح کا مطلب یہ ہو کہ قوم میں عالمگیر حکومت قائم کر لینے کا جذبہ اور ولولہ اور استطاعت کی حد تک سعی و عمل ہو تو پھر قرنِ اولیٰ ہی نہیں سارے ہی قرونِ مابعد جو اس دورِ حکومت سے قبل کے ہوں اس الزام سے بری ہو جائیں گے۔ کیونکہ ایسی حکومت جب بھی قائم ہو گی تو وہ درحقیقت اوّل سے آخر تک کی پوری اُمت کے جذبات اور مساعیٔ ممکنہ کا نتیجہ ہو گی اور اس کی تشکیل میں پوری ہی اُمت حصہ دار ہو گی۔ کیونکہ اُمت کے ایک ایک فرد کا ذہن اور عقیدہ اس میں لگا ہُوا تھا اور ہر پہلے کی ذہنیت پچھلے کے لئے بُنیاد بنتی چلی آ رہی تھی۔ جونہی ابتدائی اور درمیانی افکار و اعمال کا لگاتار سلسلہ صدیوں کے بعد اپنی انتہائی حد پر آ پہنچا اور اس مسلسل تبلیغ و عمل سے بالآخر دُنیا کی تمام قومیں اس ذہنیت پر آ گئیں تو آخری نتیجہ عالمگیر حکومت کی صورت میں نکل آیا۔ اس لئے محکومیت کے ان درمیانی قرون و ادوار میں اُمت کے کسی طبقہ کو بھی غیر صالح یا غیر مومن قرار نہیں دیا جائے گا جبکہ ہر طبقہ اس حکومت کے بنانے میں اپنی اپنی بساط کی حد تک ذہناً و عملاً شریک رہا ورنہ یہ آخری مطلوب نتیجہ اچانک برآمد کیسے ہو گیا۔ اگر افکار و مساعی کی ابتدائی اور درمیانی کڑیاں اُسے برآمدگی کی حد پر نہیں لا رہی تھیں ؟

یہی وجہ ہے کہ ہر دَور اور ہر زمانہ میں حتّٰی کہ آج بھی کسی حکومت کی تشکیل کو

صرف زمانۂ تشکیل ہی کے افراد کی طرف منسوب نہیں کر دیتے۔ بلکہ آغازِ تحریک سے لے کر اتمامِ تحریک تک کے تمام ہی افراد کی مساعی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اسی لئے اسٹیجوں پر تمام گزرے ہوئے لیڈروں اور بانیانِ تحریک کا نام زندہ رکھا جاتا ہے پنڈالوں میں اُن کے نام کے گیٹ بنائے جاتے ہیں۔ اُن کے فوٹو اور مجسّمے سجائے جاتے ہیں اور تقریر و تحریر میں عقیدت سے اُن کے تذکرہ کو زندہ رکھا جاتا ہے بلکہ بعد کے لوگوں کو (جن کے ہاتھ پر تحریک کی کامیابی ظاہر ہوتی ہے) اُن پہلے ہی لوگوں کی کاوشوں کا مظہر مانا جاتا ہے۔

پس اگر اس آیت میں وراثتِ ارض سے کُل ارض مراد لے کر عالمگیر حکومت ہی مراد لی جائے جو یقیناً اب تک قائم نہیں ہوئی تو حسبِ تصریحاتِ مفسّرین اس سے لامحالہ وہی عالمگیر حکومت مراد ہو سکتی ہے جو ظہورِ مہدی اور نزولِ عیسوی کے وقت اس دُنیا کے آخری دَور میں وقت کے خیار اہل اللہ کے ہاتھوں تشکیل پائے گی، جس کے تحت پوری دُنیا کا دین اور مسلک ایک ہو جائے گا اور لیظہرہ علی الدّین کلّہ کا کُھلا ظہور ہو جائے گا مگر جبکہ یہ حکومت پوری اُمت کے ارتقائی جذبات و افکار کا ایک ظہور ہو گا اور اُس میں قرنِ اولیٰ سے لے کر قرنِ آخر تک کے تمام مسلمان اپنے اپنے جذبات اور ممکنہ اعمال سے شریک ہوں گے تو کون کہہ سکتا ہے کہ حکومتِ عامہ سے پہلے کا کوئی طبقہ اور کوئی بھی محکوم علاقہ اس آیت کی رُو سے غیر صالح اور عملی کافر ہو گا ؟ ورنہ اس آخری طبقہ کے علاوہ جس کے ہاتھ پر اس عالمگیر تشکیل کا ظہور ہُوا سارے ہی طبقات اُمت معاذ اللہ غیر صالح اور غیر مومن ٹھہر جائیں گے جس

کا تصوّر بھی ہمارے نزدیک افجرِ فجور میں داخل ہے۔ یہاں تک کہ یہ آج کے مدّعی بھی اپنی ہی زبان سے اپنی تکفیر سے نہ بچ سکیں گے۔

(۶) پھر یہ کہ اگر آیتِ مذکورہ میں صالحین کا مفہوم استحقاقِ حکومت پیدا کرنے کی جدّوجہد اور جانکاہی کے افعال میں گھس جانے ہی کا لیا جائے اور اُس کی رُو سے وہی لوگ صالحین کے مصداق ہوں جو اس سعی کے حامل ہوں ورنہ وہ عملاً کافر اور لفظی مومن رہ جائیں۔ تب بھی کلّیتہً کوئی مسلمان طبقہ غیر صالح نہیں ٹھہر سکتا۔ کیونکہ اس تفسیر پر جہاں آیت نے تشکیلِ حکومت کی جدّوجہد کو صلاح کہا ہے وہاں اس جدّوجہد کی کسی خاص نوعیّت کی تخصیص اور تعیین نہیں کی کہ وہ کیسی ہو؟ بلکہ مطلق چھوڑ دیا ہے، جس کے اطلاق کے نیچے فوجی سعی بھی آتی ہے کہ تشدّد سے انقلاب کر دیا جائے۔ اقتصادی سعی بھی آتی ہے جیسے غاصب اقوام کا تجارتی بائیکاٹ کر کے اوّل اقتصادی اور پھر سیاسی آزادی حاصل کر لی جائے۔ صنعتی اور تمدّنی سعی بھی آتی ہے، جیسے شہری اور مُلکی ضروریات کی خود کفالت کر کے غاصبوں کی اقتصادی گرفت سے نجات حاصل کر لی جائے۔ عدمِ تشدّد اور مقاومتِ مجہول کی سعی بھی آتی ہے، جس سے غاصب قوم کو معطّل کر دیا جائے، آئینی اور پارلیمنٹری سعی بھی آتی ہے جس کے تحت الیکشنوں کے ذریعہ حکومت بدل دی جائے وغیرہ وغیرہ۔

غرض صلاح کے معنی اگر تحصیلِ حکومت کی سعی ہی کے رکھ لئے جائیں تو ان میں سے وہ کون سی سعی ہے جو اس آیت کے عموم سے باہر رہ جائے گی؟ اور جبکہ ان میں سے کسی نہ کسی سعی کو حسبِ اقتضائے مقام مسلمان اختیار کئے ہوئے

ہیں اور کرتے چلے آ رہے ہیں تو وہ کونسا استدلال ہے جس کی رُو سے وہ غیر صالح یا عملی کافر کہے جا سکتے ہوں؟ کیونکہ یا تو وہ برسرِ اقتدار ہیں یا ہوتے جا رہے ہیں یا ہونے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں اور اُن میں سے کوئی نوع بھی صالحین کے مفہوم سے باہر نہیں ہوتی، جبکہ صلاح کے معنی اس سعئ خاص ہی کے لے لئے جاویں تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ غیر صالح اور عملی کافر کس خطّہ کے مسلمان ہیں جن کو مطعون کرنے کے لئے اس آیت کو بے محل استعمال کیا جاتا ہے۔

(۷) لیکن اگر غور سے کام لیا جائے تو رُعب زدگانِ تمدّن وسیاست کے لئے دین کے برخلاف اپنے سیاسی منصوبے پُورا کرنے اور اس میں حائل شُدہ طبقات کو غیر صالح کہہ کر راستہ سے ہٹا دینے کی اس آیت میں کوئی گنجائش نہیں کیونکہ آیت میں وراثت یا حکومتِ ارضی کے حصول پر بحث نہیں بلکہ استحقاق پر گفتگو ہے اور حاصل یہ ہے کہ ہر دَور میں اللہ کے نیک اور صالح بندے ہی اس وراثت کے مستحق ہوتے رہیں گے۔

یہ دوسری بات ہے کہ فسّاق و فجّار اپنی چالاکیوں سے اُنہیں برسرِ اقتدار نہ آنے دیں اور اُن کی مساعی کو اپنی عیّارانہ مساعی سے ناکام بنا دیں۔ لیکن اس سے اُن کے استحقاق میں فرق نہیں آ سکتا۔ جیسے نسبی وراثت کے سلسلہ میں اگر اصل وارث کو غاصب لوگ محروم کر دیں جس کی وراثت پر قرآن نے اُسی طرح روشنی ڈالی ہے اور ہر ایک کا استحقاقی حصّہ بتلا دیا ہے، تو یہ نہیں کہ اصل وارث، وارث نہ رہے اور یہ متغلّب اور غاصب وارث بن گئے۔

پس آیت کا حاصل یہ نکلا کہ حکومتِ ارضی کے وارث اور مستحق حقیقتاً صلحاء

واتقیاء ہیں۔ اگرچہ کسی وجہ سے اس وراثت تک انہیں آنے نہ دیا جائے۔

نیز جب کہ ہر خبر میں کوئی نہ کوئی انشاء ضرور مخفی ہوتی ہے تو اس خبر کا کہ "حقیقی وارثانِ اقتدار نیک بندے ہیں" حاصل یہ نکلے گا کہ اقتدار کی باگ ڈور صلحاء و اتقیاء کے ہاتھ میں رکھو تاکہ وہ صلاح و عدل کے ساتھ حکومت چلائیں۔ اور نیکی و تقوے کا دُنیا میں دَور دَورہ ہو جائے۔ آیت کے یہ ایسے عام معنی ہیں کہ اس میں وہ تمام معانی داخل رہتے ہیں جو ابھی بیان کئے گئے اور کسی بھی دَور کے کسی مسلم طبقہ کو خواہ مخواہ غیر صالح یا عملی کافر بنانے کا شوق بھی پُورا نہیں ہو سکتا۔

رہا صالحین کا اقتدار سے محروم رہ جانا، کوئی عجوبہ نہیں۔ دُنیا میں ایسے اوقات بہت کم آئے ہیں کہ اقتدار کی کُنجیاں حق پرستوں کے ہاتھ میں رہی ہوں عموماً دُنیا پرست اُن کے مقابلہ میں ایکا کر کے ہر جائز و ناجائز طریق پر اقتدار غصب کرتے آئے ہیں جس کی مثالیں اُمَمِ سابقہ سے لے کر اُمّتِ مرحومہ کے اکثر قرون و دہور میں بکثرت دستیاب ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس محروم الاقتداری کے باوجود شریعت نے انہیں صالحین ہی کہا ہے۔ غیر صالح یا غیر مومن نہیں بتایا۔

حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ تعالٰے عنہا نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے روایت فرماتی ہیں :-

اِذا ظہر المعاصی فی اُمّتی عَمّھُمُ اللہ بعذاب من عندہٖ۔

"جب میری اُمّت میں معاصی غالب ہو جاتے ہیں تو اللہ اُن پر اپنا عام عذاب نازل کرتا ہے۔

فقلت یا رسول اللہ اما فیھم اناس صالحون؟ قال یصیبھم ما اصاب الناس ثم یصیرون الی مغفرۃ من اللہ و رضوان۔

"میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ان میں نیک لوگ (صالحین) نہیں ہوتے؟ فرمایا انہیں بھی وہ عذاب پہنچتا ہے جو عام لوگوں کو پہنچتا ہے۔ پھر آخرت میں وہ مغفرت و رضا کی طرف کر دیئے جاتے ہیں (یعنی اپنی نیتوں پر اُن کا حشر ہوگا، مگر یہاں عام و خاص میں کوئی تفریق نہیں ہوتی)۔

(تفسیر ابن کثیر ص ۲۹۹ ج ۲)

اس عذابِ عام کی تشخیص بھی بعض روایتوں میں فرمائی گئی ہے کہ وہ غلامی ہے :-

لیؤمرن علیکم شرارکم ثم یدعوا خیارکم فلا یستجیب لکم۔

"تم پر تمہارے میں سے بدترین لوگ حاکم بنا دیئے جاتے ہیں۔ پھر تم میں کے اچھے لوگ دعائیں بھی مانگتے ہیں تو وہ قبول نہیں کی جاتیں"

(ابن کثیر ص ۲۱۹ ج ۲)

لیکن اس کے باوجود صالحین کو صالحین اور خیار کو خیار فرمایا گیا ہے، جس سے واضح ہو گیا کہ غلامی کے باوجود صالحین کی صلاح میں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اس کا یہ مقصد بھی نہیں کہ صالحین اپنی صلاح پر غرّہ کر کے آزادی اور غلامی کا فرق اُٹھا دیں یا غلامی پر قناعت کر کے بیٹھ رہیں یا صلاح کے علوِ باطن پر قناعت کر کے علوِ ظاہر سے کنارہ کش ہو جائیں اور اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کے ساعی اور طالب نہ رہیں، نہیں بلکہ صرف یہ غرض ہے کہ طعنہ زنوں کو اِن

صالحین کے محکوم ہو جانے کے باوجود بھی اُنہیں غیر صالح یا غیر مومن کہنے کا کوئی حق نہیں۔

اور اگر یہ جسارت آیتِ وراثت ارض سے کی جا رہی ہے تو وہ بے محل ہے اور کسی جائز تفسیر پر مبنی نہیں۔ کیونکہ یہ استدلال دعویٔ عام اور دلیلِ خاص کا مصداق ہے۔

آیتِ کریمہ کے جب کہ اتنے محمل ہیں اور اس کے عموم میں اتنی وسعت ہے کہ نہ ارض سے ارضِ دُنیا ہی مراد لینا ضروری ہے، نہ ارضِ دُنیا مراد لے کر وراثت سے حکومتِ حالیہ ہی مراد لینا ضروری ہے۔ نہ حکومتِ حالیہ سے کُل زمین کی حکومت مراد لینا ہی ضروری ہے، نہ کُل زمین کی حکومت مراد لے کر اُسے کسی مقررہ وقت میں حاصل کر لیا جانا ہی ضروری ہے، تو ایسے محتمل اور کثیر المعنی استدلال سے اتنا بڑا دعوےٰ جس سے یک لخت کروڑوں مسلمان اور وہ بھی ہر دَور کے مسلمان غیر صالح اور محض لفظی مومن اور عملی کافر قرار پا جائیں۔ آخر کس طرح ثابت ہو جائے گا اور کیسے جائز ہو گا؟ اور جب کہ آیت کا وہ جامع اور وسیع مفہوم لیا جائے، جس کے نیچے یہ تمام معانی آ جائیں، یعنی استحقاقِ وراثت، عام اس سے کہ حصول ہو یا نہ ہو، تو پھر یہ تکفیرِ مسلمین کا دعوےٰ ثابت نہیں ہو سکتا، بلکہ اس سے بحالتِ محکومی صالحین کا صلاح زائل تو کیا ہوتا، یہ آیت اس صلاح کے ثبوت کی دلیل بن جاتی ہے۔

بہرحال صالحین کا سماوی طور پر گرفتارِ محکومی ہو جانا معصیت ضرور

ہے، لیکن معصیت نہیں، کہ وہ تو بیک جنبشِ قلم غیر صالح بنا دیئے جائیں اور غاصبانِ اقتدار، فاسقِ مُعلِن ہوتے ہوئے بھی صالح رہیں۔

الحاصل ان عرض کردہ سطور سے ان نظریات کی اصلیت کُھل جاتی ہے جنہیں "دو قرآن" کے انوکھے عنوان سے بطور ایجادِ بندہ آیاتِ تکوین کا مدلول بتلا کر پیش کیا گیا ہے اور اُن کی رُو سے مادی وسائلِ زندگی اور مادہ کی توڑ پھوڑ یا ترکیب و تحلیل سے کچھ اسبابِ عیش اور کچھ اسبابِ ہلاکت ایجاد کرتے رہنے اور بالفاظِ دیگر اُن سے تاجرانہ طریق پر منتفع ہوتے رہنے ہی کو مقصدِ حیات اور اسلام کی اصل ترقی باور کرایا گیا ہے اور پھر اُن پر قابو پا لینے اور اُن کے ذریعہ کچھ رسمی جاہ و اقتدار حاصل کر لینے ہی کا نام خلافت اور ایمانداری بتلایا گیا ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ:-

(۱) آیاتِ تکوین کی رُو سے صحیفۂ کائنات کا مطالعہ ضروری ہے لیکن معرفتِ صانع کے لئے نہ کہ محض معرفتِ مصنوعات اور مادّہ کی توڑ پھوڑ سے صنعتی کاروبار چلانے کے لئے۔

(۲) مادّی اقتدار ضروری ہے، لیکن قانونِ فطرت کو نافذ العمل بنانے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے نہ کہ استبداد و تعیش اور اعلائے کلمۃ الفسق کے لئے۔

(۳) استخلاف فی الارض ضروری ہے، لیکن مادّی حوائج سے غنی بن کر کامل بننے اور بنانے کے لئے، نہ کہ وفورِ اسباب سے اپنی محتاجگی کو بڑھانے اور دُنیا کی نقالی کرنے کے لئے۔

(۴) مدنیت اور تمدنی اکتشافات بقدرِ ضرورت ضروری ہیں۔ لیکن تعاونِ باہمی میں ازدیاد کے لئے، نہ کہ مادیت میں غلو اور فناء فی العیش ہوجانے کے لئے۔

(۵) تسخیرِ کائنات ضروری ہے لیکن روحانی تصرفات کی مشق بہم پہنچانے اور صورتوں کے راستہ سے حقائق تک پہنچنے کے لئے، نہ کہ مادی تصرفات میں محصور اور محدود رہ کر صورت پرستیوں اور مختلف الاشکال ڈیزائنوں میں غرق ہوجانے کے لئے۔

(۶) اعداءُ اللہ کی تخویف کے لئے امکانی تیاری (اعدادُ مستطاع) ضروری ہے، لیکن دشمن کی نقالی یا اس کی طرح عَدَد او عُدَد پر کلیتہً اعتماد کے ساتھ نہیں، بلکہ فی الجملہ ان اشیاء کی رعایت رکھ کر، قوتِ قلب، حوصلۂ یقین اور حکیمانہ تدابیر کی ضرورت کے ساتھ۔

(۷) اور بالآخر یہ تمام امور، تمدن، سیاست، امارت، تسخیر، تکوین وغیرہ ضروری ہیں۔ مگر رضائے الٰہی اور قربِ حق کے لئے، نہ کہ رضائے نفس اور رضائے غیر کے لئے۔

(۸) اور خلاصہ یہ ہے کہ جب کہ ان تمام دینی مقاصد کی تحصیل بغیر اتباعِ نبویؐ کے ناممکن ہے جو حقیقتاً عملی قرآن ہے، تو بطور تفننِ طبع اگر تعددِ قرآن کا نظریہ موزوں ہے تو "تین قرآن" کے عنوان کے ساتھ تاکہ کتابُ اللہ علمی قرآن ہو، کائناتُ اللہ برہانی اور تمثیلی قرآن ہو اور رسولُ اللہ کی ذاتِ اقدس عملی قرآن ہو، نہ کہ "دو قرآن" کے نظریہ کے ساتھ، جس میں سے تمثیلی

قرآن تو سرے سے حذف ہوجائے اور علمی قرآن باقی بھی رہے تو تلبیس کے ساتھ اور غیر واقعی ہوکر، یعنی بجائے ذاتِ نبویؐ کے کائنات آجائے جس سے کوئی اُسوہ اور عملی نمونہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔

بہرحال اس مضمون کی جُملہ تفصیلات اور آخر میں اس نمبروار خلاصہ سے یہ مخفی نہیں رہتا کہ میرا مقصد مسلمانوں کی مادی، صنعتی، عسکری اور دوسری انواع کی قوت و شوکت یا حسبِ ضرورت دُنیا کے ترقی یافتہ وسائل کے استعمال سے گریز یا انکار کرنا نہیں بلکہ اُنہیں آیاتِ تکوین کا مدلول کہے جانے، اُن کے معیارِ کفر و اسلام ہونے اور اُنہیں مقصدِ حیات کہکر اپنی ترقی کا میدان بنا لینے یا غُلو و افراط اور مبالغوں سے اُن میں منہمک اور فنا رہو جانے پر نکیر و انکار کرنا ہے۔

کیونکہ ان امور کی مقصودیت کا حاصل مادیتِ خالصہ ہے اور مادیت کا طبعی ثمرہ افراطِ عیش اور اس مفرطِ عیش کا حاصل طغیان و سرکشی ہے جو نیتجتہً حق سے بغاوت ہے اور تیاریٔ آخرت اور اعلائے کلمۃ اللہ میں حارج ہے جس کا دوسرا نام فساد فی الارض ہے اور ظاہر ہے کہ یہ خلافت نہیں بلکہ خلافت کی ضد ہے۔

اور کون نہیں جانتا کہ اس ضدِ خلافت کو خلافت کہنا بلاشُبہ تلبیسِ حق بالباطل اور کتمانِ حق ہے۔ وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

اِن حقائق کے اصولی طور پر واضح ہوجانے کے بعد ضرورت نہیں رہتی

کہ "دو قرآن" کے ہر ہر جزئیہ کے بارے میں علیحدہ علیحدہ کچھ کہا جائے جب کہ اصل نظریہ کے بارے میں اصولی تنقید اور تحقیق سامنے آگئی جو اِن جزئیات کی روح اور قدرِ مشترک ہے جس سے تمام جزئیات کا خود ہی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کا موضوع بھی جزئیات میں کلام کرنا نہ تھا، بلکہ نظریات کی حد تک اصولی معروضات پیش کرنا تھا، جو ضرورت کی حد تک پیش کر دی گئیں۔

فَاِنْ یَّکُ صَوَابًا فَمِنَ اللّٰہِ وَاِنْ یَّکُ خَطَأً فَمِنِّیْ وَمِنَ الشَّیْطَانِ۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔ وَ بِاللّٰہِ التَّوْفِیْقِ ؞

احقر

محمد طیب غفرلہٗ مہتمم دار العلوم دیوبند

اَلْفَوْزُ الْکَبِیْر

فِی

اُصُوْلِ التَّفْسِیْر

اصولِ تفسیر پر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی مشہور درسی کتاب

اور

"تفسیر کے چند ضروری اصول"

کے عنوان سے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کا جدید علمی مقالہ

586